ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے اِن مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیدئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

فہرست مضامین

جلد ۲۷ | بابت ماہ رمضان و شوال سنہ ۱۳۶۴ھ مطابق ستمبر و اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء | عدد ۳، ۴

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس، چمبرلین روڈ، لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام متصل پٹھان کوٹ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان کے پچھلے دو پرچوں میں تقویٰ پر ہم نے جو بحث کی ہے نا تمام رہے گی اگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں بھی یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ لیکن احادیث پر غور کرنے سے پہلے احادیث کے متعلق ایک اصولی حقیقت پیش نظر رکھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ جس طرح اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق ناجائز ہے، ہم یہ نہیں کر سکتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کردیں۔ جس طرح قرآن کی آیتوں کو آپس میں ٹکرانا حرام ہے، ہم یہ نہیں کر سکتے کہ بعض کو حجت واستدلال کے لیے اختیار کریں اور بعض کو چھوڑ دیں، اسی طرح یہ بات بھی بالکل ناجائز ہے کہ رسول کے اقوال وارشادات میں سے کچھ کو ہم اپنے عمل یا استدلال کے لیے اختیار کرلیں اور کچھ کو نظرانداز کردیں۔ ان تمام صورتوں میں بعض کو چھوڑنا سب کو چھوڑنے کے ہم معنی ہے اور نہایت بیوقوف ہے وہ مسلمان جو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات میں اس طرح کی تقسیم کرتا ہے۔ لیکن اس طرح کی تفریق وتقسیم کا فتنہ آج عام ہے۔ کتنے مسلمان ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اسی طرح کی تفریق کرکے اپنے زعم میں نہایت متقی بنے پھر رہے ہیں حالانکہ وہ اگر آپ کی تعلیمات پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالیں تو انھیں معلوم ہو کہ تقویٰ تو درکنار ان کا ایمان واسلام بھی معرض خطر میں ہے۔ اس بات کو مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے بعض دعائیں صحابہ کو سکھائیں یا بعض نوافل کی تلقین کی اور ان پر کوئی غیر معمولی اجر وثواب بیان فرمایا تو بعض لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص بھی اس دعا یا نفل کا التزام کرلے اس کے لیے یہ اجر وثواب اور یہ درجہ اور مقام ہے اگرچہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس کا رویہ رسول کی ہدایات کے موافق ہو یا نہ ہو۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ بعض نوافل اور بعض اوراد پر جو بڑی بڑی برکتوں کا احادیث میں ذکر آیا ہے یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ساری زندگی کو حدود شریعت کے اندر رکھتے ہوئے ان اوراد ونوافل کا التزام کرتے ہیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ ایک طرف کوئی شخص کسی وظیفہ اور نفل کا پابند ہو اور دوسری طرف اس کی کمائی حرام کی ہو۔ ایک طرف تو وہ رات رات بھر نفلیں پڑھتا ہو اور تسبیحیں گردانتا ہو لیکن دوسری طرف وہ سارا دن کسی نظام باطل کی خدمت واطاعت میں بسر کرتا ہو، ایک طرف تو نمازوں میں اس کی پنڈلیاں سوج سوج جاتی ہوں لیکن دوسری طرف اس کے پڑوسیوں اور اس کے اقربا کو اس کے فتنوں سے کسی وقت امان حاصل نہ ہو۔ ایسے شخص کے لیے اپنے اوراد ووظائف سے تقویٰ کا درجہ حاصل کرنا تو الگ رہا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایمان بھی معتبر نہیں ہے، کیونکہ نبی صلعم نے اگر ایک طرف یہ فرمایا ہے کہ فلاں دعا سے آدمی کے اتنے گناہ معاف ہوجاتے ہیں یا اس کے مدارج اتنے بلند ہوتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی فرمایا ہے کہ حرام خور کی کوئی دعا بھی قبول نہیں ہوتی، اگر ایک طرف یہ ارشاد فرمایا ہے کہ راتوں کو جاگ کر نفلیں پڑھنے کا

بڑا اجر و ثواب ہے تو دوسری طرف یہ بھی فرمایا ہے کہ یتیم کا حق ہڑپ کرنے والا اپنا ایمان بھی ضائع کر دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے رسول کے احکام و ہدایات میں سے کچھ باتیں منتخب کر لی ہیں اور ان پر عمل کر کے مطمئن ہیں کہ وہ متقی بن گئے ہیں۔ وہ سخت مغالطہ اور فتنہ میں مبتلا ہیں۔ اللہ کا رسول کوئی دوکاندار بنکر نہیں آتا کہ آپ کو اس کی دوکان کا جو مال پسند آئے وہ دام دے کر خرید لیجیے بلکہ وہ آپ کی ساری زندگی کے لیے واجب الاطاعت ہادی بنکر آتا ہے کہ نقد دل اور نقد جان دونوں اس کی نذر کیجیے اور زندگی کے ہر گوشہ میں اس کے نمونہ کی پیروی کیجیے۔

اور یہ بات بالکل عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جو کسان ایک دانہ زمین میں ڈالتا ہے وہ دس پاتا ہے تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ یہی نتیجہ اس صورت میں بھی برآمد ہوگا جبکہ بیج سڑا ہوا ہو یا زرخیز اور تیار کی ہوئی زمین کے بجائے کسی بنجر زمین میں ہی ڈال دیا گیا ہو، یا تخم ریزی کے موسم کے بجائے بالکل بے وقت اور بالکل خلاف موسم ہی پھینک دیا گیا ہو یا بیج ڈالنے کے بعد ارضی و سماوی آفتوں سے اس کے بچانے کی کوشش بھی نہ کی گئی ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کسان کھیتی کی ساری شرطیں پوری کرتا ہے اس کے لیے قانون قدرت نے یہ برکت رکھی ہے کہ وہ ایک دانہ پر جو محنت صرف کرتا ہے اس کے صلہ میں دس پاتا ہے۔ باقی رہا وہ احمق دہقان جو صبح کو تخم ریزی کرتا ہے اور شام کو جا کر اس پر ہل چلا دیتا ہے تو کھیت بھرنا تو الگ رہا وہ اپنی محنت اور اپنا سرمایہ بھی برباد کرتا ہے اور پڑوسیوں کے طعنے بھی سنتا ہے۔ یہی حال ان مسلمانوں کا ہے جو کسی نیکی کے کلمہ یا تقویٰ کے کام کو پورے تقویٰ کا اصل مقام سمجھے بیٹھے ہیں اور اس امر کی انھیں بالکل خبر نہیں ہے کہ اپنی بعض نیکیوں سے اپنے تقویٰ کی عمارت شب میں جتنی اونچی کرتے ہیں دن میں اپنے اعمال کے ہاتھوں اسے اس سے زیادہ ڈھا دیتے ہیں۔ یہ سادہ لوح یہ تو جانتے ہیں کہ فلاں کلمہ کو اتنی بار پڑھ لینے سے یہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور فلاں وقت اتنی رکعتیں نفل کی ادا کر لینے سے یہ ثواب ملتا ہے لیکن یہ بالکل نہیں جانتے کہ جس رسول نے یہ باتیں بتائی ہیں اسی نے یہ بھی بتایا ہے کہ فلاں فلاں باتیں کرنے سے آدمی کی یہ ساری سعی اکارت چلی جاتی ہے۔

احادیث کے متعلق یہ اصولی حقیقت پیش نظر رکھکر اگر آپ حدیثوں پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقویٰ کی جو حقیقت ہم نے قرآن مجید سے متعین کی ہے اسی کی تائید نبی صلعم کے ارشادات سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کے حدود کی کامل نگہداشت کا نام ہے۔ یہ زندگی کی عام شاہراہ سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کو خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کے اندر بسر کرنے ہی کا نام تقویٰ ہے۔ یہ کسی درجہ میں بھی زندگی کے مطالبات و مقتضیات کی نہ تو نفی کرتا نہ ان میں مزاحم ہوتا البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ زندگی کے کسی مطالبہ کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی فطری یا اخلاقی حدود سے متجاوز ہو کر فرد یا معاشرے کو کسی مادی یا اخلاقی ہلاکت میں ڈالدے۔ یہ فطری قابلیتوں کی راہ میں کوئی عائق، نفس کی خواہشوں کی راہ میں کوئی روک، دل و دماغ اور سمع و بصر کی جولانیوں اور بلند پروازیوں کے لیے کوئی مانع نہیں ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ ان کی کار فرمائی کے لیے ایک صراط مستقیم سامنے کر دے اور اس کے ہر طرف نشانات راہ قائم کر دے تاکہ کسی منزل میں انسان بے راہ روی میں پڑ کر اپنے نفس پر یا دوسروں پر ظلم نہ کر سکے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے احادیث میں جس قوت و شدت کے ساتھ لوگوں کو تقویٰ کی تلقین فرمائی ہے اسی قوت کے ساتھ تقویٰ کے ان غلط رجحانات کو روکا ہے جو کسی نوعیت سے فطرت

انسانی کی ترقیوں کی راہ میں مزاحم ہو سکتے تھے۔ حضورؐ نے اس بات کو بھی کبھی پسند نہیں فرمایا کہ حدود الٰہی کی حفاظت و نگہداشت کے سوا اس کی کوئی خاص صورت و ہیئت قرار پائے اور لوگ باسم تقویٰ اس کو بت بنا کر پوجنے لگیں۔ نیز اس بات کی بھی نہایت واضح الفاظ میں تصریح فرمائی کہ تقویٰ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو زہد و انقطاع سے کوئی خاص لگاؤ ہو بلکہ اللہ کے دین پر چلنے اور چلانے کی ہر جدوجہد، خدا کی شریعت کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہر کوشش تقویٰ ہی کی راہ میں جہاد ہے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تقویٰ کے سب سے بڑے عالم بھی تھے اور سب سے بڑے عامل بھی، عملاً زہاد و عباد کے حلقوں پر ان لوگوں کی مجلس کو ترجیح دی جو اوراد و نوافل کے بجائے خدا کے حدود و محارم کو سمجھنے اور سمجھانے میں اپنا وقت صرف کر رہے تھے۔ یہ اجمال ہے۔ اب اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے۔

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تقویٰ کی حد کیا بیان فرمائی ہے۔ نعمان بن بشیر سے روایت ہے:۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحلال بین والحرام بین وبینھما مشتبھات لا یعلمھن کثیر من الناس فمن اتقی الشبھات استبرأ لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبھات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشک ان یرتع فیہ الا وان لکل ملک حمی الا وان حمی اللہ محارمہ (متفق علیہ)

کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان کے درمیان کچھ چیزیں مشتبہ ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے پس جو شبہات سے بچا وہ اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لے گیا اور جو شبہات میں پڑا وہ حرام میں مبتلا ہوا جس طرح وہ چرواہا جو چراگاہ کے پاس اپنا گلہ چراتا ہے اغلب ہے کہ اس کا گلہ چراگاہ میں بڑھ جائے۔ آگاہ ہر بادشاہ کے پاس محفوظ علاقہ ہوتا ہے اور اللہ کا محفوظ علاقہ اس کے محارم ہیں۔

اس حدیث میں حضورؐ نے یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ جو چیزیں حلال ہیں وہ واضح طور پر معلوم ہیں اور جو چیزیں حرام ہیں ان کی بھی اللہ کی کتاب اور سنت میں تصریح کر دی گئی ہے پس ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حلال اور اس کی حرام کی ہوئی چیز کو حرام قرار دے۔ یہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ لیکن حلال ظاہر اور حرام ظاہر کے درمیان کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی نسبت قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حرام ہیں یا حلال۔ ایسی صورتوں میں جو شخص احتیاط کے پہلو کو اختیار کرے اور مشتبہ میں نہ پڑے وہ متقی مسلمان ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ اونٹ کو نگلنے کے بعد مچھر کو چھان کر تقویٰ کی نمائش کرتے ہیں ان کا تقویٰ محض فریب ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے احکام و حدود کا پورا پابند ہو اور جب اس کے سامنے کوئی ایسی چیز آئے جس میں جانب حق اس پر پوری طرح واضح نہ ہو تو وہ اشتباہ کے پہلو کو چھوڑ کر طمانیت کے پہلو کو اختیار کرے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ متقی ہے اور اس کا دین اور اس کی آبرو ہر تہمت اور اشتباہ سے محفوظ ہے۔ یہی حقیقت کہ حضورؐ نے مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے۔ اور چونکہ تقویٰ کی اصلی حد متعین کرنے میں ان احادیث سے خاص مدد مل سکتی ہے اس وجہ سے ہم ان میں سے بعض یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

عن وابصۃ بن معبد ان رسول اللہ صلعم قال یا وابصۃ جئت تسأل عن البر والاثم قلت نعم قال فجمع اصابعہ فضرب بھا صدرہ وقال استفت

وابصہ بن معبد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اے وابصہ تم بر و اثم کی حقیقت پوچھنے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ۔ آپ نے اپنا پنجہ برابر کیا اور اس کو میرے سینے پر مارا اور

نفسك (استفت قلبك ثلاثاً) البر ما اطمأنت اليه النفس واطمأن اليه القلب والاثم ما حاك في النفس وتردد في الصدر وان افتاك الناس (رواه احمد والدارمی)

فرمایا اپنے نفس سے پوچھو، اپنے دل سے سوال کرو (تین مرتبہ فرمایا) بِرّ وہ ہے جس پر تمہارا دل مطمئن ہو جائے اور اثم وہ ہے جو دل میں کھٹکے اگرچہ لوگوں نے اس کا فتویٰ دیدیا ہو۔

وابصہ بن معبد کا یہ سوال بھی اس حالت سے متعلق ہے جبکہ آدمی کے سامنے حق کا پہلو واضح نہ ہو۔ ایسی صورت میں تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اس پہلو کو اختیار کرے جس میں دل طمانیت محسوس کرے اور جس بات میں خلش محسوس کرے اس سے احتیاط کرے۔

ایک دوسری روایت میں اسی مضمون کی مزید شرح ہے کہ متقی کے لیے بسا اوقات اندیشۂ معصیت سے بچنے کے لیے اس چیز سے احتیاط کرنی پڑتی ہے جس میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہوتا۔

لا يبلغ العبد ان يكون من المتقين حتى يدع ما لا باس به حذراً لما به باس (رواه الترمذی وابن ماجہ)

کوئی بندہ متقیوں میں سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس چیز کی وجہ سے جس میں اس کو اندیشہ ہے بعض ان چیزوں سے احتراز نہ کرے جن میں بظاہر اندیشہ نہیں ہے۔

عن الحسن بن علی قال حفظت من رسول الله صلی الله علیه وسلم دع ما یریبك الی ما لا یریبك فان الصدق طمانینة وان الكذب ریبة (رواه احمد والترمذی)

حسن بن علیؓ سے روایت ہے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات محفوظ رکھی ہے کہ اس پہلو کو چھوڑ دو جو خلجان میں ڈالتا ہے اور اس چیز کو اختیار کرو جو خلجان میں نہیں ڈالتا۔ صحیح چیز طمانیت بخشتی ہے اور غلط چیز خلجان میں ڈالتی ہے۔

ان ساری حدیثوں میں ایک ہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ ان پر غور کیجیے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ تقویٰ یہ ہے کہ ہر گوشۂ زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام و حدود کی پوری پابندی کرے اور جہاں کہیں اس کے سامنے کوئی ایسا موڑ آئے جس پر شریعت الٰہی کا کوئی واضح نشان اس کی رہنمائی کے لیے نہ ہو تو اپنے دل سے استفتا کرے اور اس پہلو کو اختیار کرے جس میں اس کا دل طمانیت محسوس کرے۔ اس پہلو کو نہ اختیار کرے جو اس کے دل میں کھٹکے۔ جو شخص اس احتیاط کے ساتھ اپنی زندگی میں حدود الٰہی کی نگرانی کر رہا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق متقی ہے۔

لیکن گناہ سے بچنے کے لیے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احتیاط کے پہلو پر اس حد تک زور دیا وہیں تقویٰ کا صحیح توازن قائم رکھنے کے لیے اس امر کی بھی تصریح فرما دی کہ یہ احتیاط کہیں وسوسہ کی شکل نہ اختیار کر لے اور اس کے ڈانڈے نصاریٰ کی رہبانیت سے نہ مل جائیں۔ چنانچہ قبیصہ بن ہلب سے روایت ہے۔

عن قبيصة بن هلب عن ابيه قال سألت النبي صلی الله علیه وسلم عن طعام النصاری وفي رواية سأله رجل فقال ان من الطعام طعاما اتحرج منه فقال لا يتخلجن في صدرك شيء ضارعت فيه النصرانية (رواه الترمذی وابوداؤد)

قبیصہ بن ہلب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نصاریٰ کے کھانوں کے متعلق دریافت کیا۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ سے کسی اور شخص نے پوچھا کہ کھانوں میں سے بعض ایسے ہیں جن سے میرے دل میں کھٹک پیدا ہوتی ہے آپ نے فرمایا تمہارے دل میں کوئی ایسی کھٹک نہ پیدا ہو جو نصاریٰ کی رہبانیت کے مشابہ ہو۔

اس حدیث کو اوپر کی احادیث سے ملا کر دیکھیے تو وہ صحیح اور متوازن تقویٰ بالکل ممیز ہو کر سامنے آجاتا ہے جس میں نہ تو اشتباہ

کی صورت میں میلان الی المعصیۃ کا شائبہ ہے اور نہ احتیاط کی بے اعتدالی اور متقشفانہ وہمی پن کی کوئی آمیزش ہے بلکہ تقویٰ کی جو اصل حقیقت ہے بالکل تول کر سامنے رکھدی گئی ہے۔ یہی تقویٰ اللہ اور اس کے رسول کو مطلوب ہے ورنہ احتیاط میں جب وسوسہ کو دخل ہوجاتا ہے تو اسی سے وہ راہبانہ تقویٰ وجود میں آتا ہے جو اللہ ورسول کو اسی طرح ناپسند ہے جس طرح حدود الٰہی کے احترام میں رخصت پسندی اور سہل انکاری۔

اب ان احادیث پر غور فرمائیے جن سے اس بات کی نہایت واضح تردید ہوتی ہے کہ تقویٰ کسی نوعیت سے بھی زندگی کے مطالبات ومقتضیات کی نفی کرتا ہے۔

عن عثمان بن مظعون قال یا رسول اللہ ائذن لنا فی الاختصاء فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس منا من خصی ولا اختصی ان خصاء امتی الصیام فقال ائذن لنا فی السیاحۃ فقال ان سیاحۃ امتی الجہاد فی سبیل اللہ فقال ائذن لنا فی الترہب فقال ان ترہب امتی الجلوس فی المساجد انتظار الصلوٰۃ

(رواہ فی شرح السنۃ)

عثمان ابن مظعون سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم کو خصی ہوجانے کی اجازت دیجیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے خصی کیا اور جو خصی ہوا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ میری امت کا خصی ہونا روزہ رکھنا ہے۔ کہا تو اچھا بن باس ہونے کی اجازت دیجیے فرمایا میری امت کا بن باس ہونا یہ ہے کہ وہ راہ خدا میں جہاد کرے، کہا اچھا تو ترک دنیا کی اجازت دیجیے فرمایا میری امت کے لیے نماز کے انتظار میں مسجد میں بیٹھنا ترک دنیا ہے۔

بعض لوگ جنھوں نے تقویٰ کے غلط تصور میں مبتلا ہوکر، زندگی کے مطالبات وضروریات میں عدم توازن پیدا کردیا تھا اور زہد وعبادت کی طرف جھک پڑے تھے حضورؐ نے ان کو نہایت سختی کے ساتھ ٹوکا اور ان کو متوازن زندگی بسر کرنے کی ہدایت فرمائی۔

عن عبد اللہ بن عمرو العاص قال قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا عبد اللہ الم اخبر انک تصوم النہار وتقوم اللیل فقلت بلی یا رسول اللہ قال فلا تفعل صم وافطر وقم ونم فان لجسدک علیک حقا وان لعینک علیک حقا وان لزوجک علیک حقا وان لزورک علیک حقا

عبد اللہ بن عمرو العاص سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم دن کو روزے رکھتے ہو اور رات بھر نماز پڑھا کرتے ہو، میں نے عرض کیا کہ صحیح ہے یا رسول اللہ آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو کبھی روزہ رکھو کبھی افطار کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔ کیونکہ تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری جورو کا بھی تم پر حق ہے اور تمھارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔

بعض لوگ مباحات[لہ] اور رخصتوں سے مستفید ہونا شان تقویٰ کے منافی سمجھتے ہیں اور ہر منزل میں اپنا ڈیرہ سنگلاخ زمین

لہ اوپر ایک روایت ہم نے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کے لیے اندیشۂ معصیت سے بعض بعض ایسی چیزیں بھی چھوڑنی پڑتی ہیں جن میں بظاہر کوئی ہرج نہیں ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب امر حق مشتبہ ہو۔ ایسی صورت میں بلاشبہ تقویٰ یہی ہے کہ آدمی احتیاط کا پہلو اختیار کرے اور مباح مشتبہ سے فائدہ نہ اٹھائے لیکن جس مباح یا جس رخصت پر قلب مطمئن ہے محض اس خیال سے اس کو چھوڑنا کہ اعلیٰ دینداری کی یہ راہ اختیار کرنے کی ہے یہ تقویٰ نہیں ہے بلکہ تقویٰ سے دھینگا مشتی ہے۔ (امین احسن)

میں ہی ڈالنا کمال دینداری سمجھتے ہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ فرمایا:۔

عن عائشۃ قالت صنع رسول اللہ صلعم شیئا فرخص فیہ فتنزہ عنہ قوم فبلغ ذلک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخطب فحمد اللہ ثم قال ما بال اقوام یتنزھون عن الشئ اصنعہ فواللہ انی لا علمھم باللہ واشدھم لہ خشیۃ (متفق علیہ)............

حضرت عائشہ سے روایت ہے، فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام کیا پھر اس میں رخصت دیدی تو بعض لوگ اس رخصت سے فائدہ اٹھانے میں احتراز کرنے لگے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے خطبہ دیا، اللہ تعالیٰ کی حمد کی پھر فرمایا بعض لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بعض ایسی باتوں سے احتراز کرتے ہیں جن کو میں کرتا ہوں۔ خدا کی قسم میں ان سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جاننے والا ہوں اور ان سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں

ابوداؤد میں ایک روایت اس سے بھی زیادہ واضح ہے:۔

عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول لا تشددوا علی انفسکم فیشدد اللہ علیکم فان قوما شددوا علی انفسھم فشدد اللہ علیھم فتلک بقایاھم فی الصوامع والدیار رھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اپنے اوپر سختی مت کرو کہ اللہ بھی تم پر سختی کرنے لگے۔ ایک قوم نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ انہی کی یادگاریں کلیساؤں اور گرجوں میں دیکھ رہے ہو۔ یہ ان کی گڑھی ہوئی رہبانیت ہے جس کو اللہ نے ان کے اوپر فرض نہیں کیا

یہ حدیثیں اس بات کا صاف ثبوت ہیں کہ جس طرح رخصتوں کی تلاش اور مباحات سے فائدہ اٹھانے میں جانب حق کی رعایت سے بے پروائی تقویٰ کے خلاف ہے اسی طرح دین میں خواہ مخواہ سختی اور تشدد کے پہلو کا التزام بھی تقویٰ کے منافی ہے۔ تقویٰ کی راہ اس سہل انکاری اور دین تشدد پسندی کے بیچ سے ہو کے نکلی ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تقویٰ کا اصلی کام زہد و عبادت ہے۔ آدمی کسی گوشہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے، نمازیں پڑھے، روزے رکھے اور اوراد و نوافل میں مشغول رہے بس یہ کام اصلی تقویٰ کے کام ہیں۔ اس کے علاوہ جو کام ہیں، اگرچہ وہ دین کے کام ہوں لیکن موجودہ زمانہ کے ارباب تقویٰ ان کو تقویٰ کے کام نہیں سمجھتے۔ تقویٰ کا جز و اعظم ان کے ہاں عبادت ہے۔ جو شخص اس چیز میں جتنا ہی اضافہ کرتا جائے وہ تقویٰ میں اسی قدر مدارج طے کرتا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح الفاظ میں اس غلط رجحان کی بھی تردید فرمائی ہے۔

عن انس قال جاء ثلثۃ رھط الی ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسألون عن عبادتہ فلما اخبروا بھا کانھم تقالوھا فقالوا این نحن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقد غفر اللہ لہ ما تقدم من ذنبہ وما تاخر فقال احدھم اما انا فاصلی اللیل ابدا

حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے پاس تین جماعتیں آپ کی عبادت کا حال پوچھنے آئیں۔ جب ان کو آپ کی عبادت کا پورا پورا حال بتایا گیا تو کچھ ایسا ظاہر ہوا کہ ان کی نظر میں یہ بہت کم ہے۔ پھر وہ بولے کہ ہمارا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقابلہ آپ کے تو تمام اگلے اور پچھلے گناہ بخش دیے جا چکے ہیں۔ پھر ان لوگوں میں سے ایک شخص بولا

وقال الآخر انا اصوم النهار ولا افطر وقال الآخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا فجاء النبي صلى الله عليه وسلم اليهم فقال انتم الذين قلتم كذا وكذا اما والله انى لاخشاكم لله واتقاكم له ولكنى اصوم و افطر واصلى وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتى فليس منى (متفق علیہ)

میں ہمیشہ رات بھر عبادت کیا کروں گا، ایک دوسرا بولا میں ہمیشہ روزے رکھا کروں گا، کبھی ناغہ نہ ہونے دوں گا، ایک تیسرے نے کہا، میں عورتوں سے بالکل قطع تعلق کروں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگئے۔ آپ نے فرمایا تمھی لوگ یہ یہ کہہ رہے تھے، خدا کی قسم میں تم سے کہیں زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس سے تقوی اختیار کرنے والا ہوں لیکن اس کے باوجود روزے بھی رکھتا ہوں، ناغہ بھی کرتا ہوں، نمازیں بھی پڑھتا ہوں، آرام بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس نے میرے طریقہ سے انحراف اختیار کیا وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔

ایک دوسری حدیث ملاحظہ ہو:۔

عن الحسن قال سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم ان رجلين كانا فى بنى اسرائيل احدهما كان عالما يصلى المكتوبة ثم يجلس فيعلم الناس الخير والاخر يصوم النهار ويقوم الليل ايهما افضل قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فضل هذا العالم الذى يصلى المكتوبة ثم يجلس فيعلم الناس الخير على العابد الذى يصوم النهار ويقوم الليل كفضلى على ادناكم

حضرت حسن سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بنی اسرائیل کے دو شخصوں کی بابت دریافت کیا گیا، ایک عالم تھا جو نماز فرض پڑھ کر بیٹھ جاتا اور لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دیتا اور دوسرا دن میں روزے رکھتا اور شب میں نمازیں پڑھا کرتا۔ ان میں سے کون افضل ہے۔ حضور نے فرمایا یہ عالم جو فرض پڑھ کر لوگوں کی تعلیم میں مشغول ہو جاتا ہے اس عابد پر جو دن میں روزے رکھتا اور شب میں عبادت کرتا ہے وہی فضیلت رکھتا ہے جو میں تم میں سے ایک ادنی ترین فرد پر رکھتا ہوں۔

عن ابن عباس قال تدارس العلم ساعة من الليل خير من احيائها (رواه الدارمی)

ابن عباس سے مروی ہے کہ شب میں ایک گھنٹہ علم کا مذاکرہ شب زندہ داری سے بہتر ہے۔

عن عبد الله بن عمرو ان رسول الله صلى الله عليه وسلم مر بمجلسين فى مسجده فقال كلاهما على خير واحدهما افضل من صاحبه اما هؤلاء فيدعون الله ويرغبون اليه فان شاء اعطاهم وان شاء منعهم واما هؤلاء فيتعلمون الفقه او العلم ويعلمون الجاهل فهم افضل وانما بعثت معلما فجلس فيهم

عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مسجد میں دو جماعتیں دیکھیں اور فرمایا دونوں اچھے کام کر رہی ہیں لیکن ایک دوسری سے افضل ہے۔ یہ لوگ اللہ کو یاد کر رہے ہیں اور اس کی طلب میں لگے ہیں۔ اگر اللہ چاہے گا انھیں بامراد کرے گا اور اگر چاہے گا محروم کر دے گا۔ رہے یہ دوسرے لوگ تو یہ علم دین کے سیکھنے میں لگے ہیں (یا علم دین حاصل کر رہے ہیں) اور جاہلوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ یہ لوگ ان سے افضل ہیں اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور یہ کہہ کر انہی کے ساتھ بیٹھ گئے۔

ان تمام روایات سے ثابت ہے کہ زندگی کو ایک توازن کے ساتھ اللہ کے حدود کے اندر بسر کرنے کا نام تقوی ہے۔ ایک شخص اگر فرائض ادا کر کے اپنا بقیہ سارا وقت دین کے سیکھنے سکھانے اور اس کی اقامت کی جد وجہد میں صرف کر رہا ہے تو وہ ان لوگوں سے کہیں زیادہ متقی ہے جو رات رات بھر نمازیں پڑھتے ہیں، اوراد و وظائف میں مشغول رہتے ہیں لیکن تعلیم دین یا اقامت دین

کی جد و جہد میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

ایک نہایت غلط رجحان تقویٰ کے متعلق یہ بھی لوگوں میں پیدا ہوگیا ہے کہ محرمات سے اجتناب کو لوگ تقویٰ کے لیے اتنا ضروری نہیں سمجھتے جتنا نوافل کی زیادتی کو سمجھتے ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ تقویٰ میں اصل شے جس کا اہتمام مطلوب ہے محرمات اور مشتبہات سے اجتناب ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص کتنی ہی عبادتیں کرے لیکن تقویٰ کے مقام کو نہیں حاصل کرسکتا۔ اس زمانہ میں ہم عام طور پر دیکھ رہے ہیں کہ نظام باطل کی خدمت کرنے والے، دنیا پرست امرا کی خوشامدیں کرنے والے، حرام کے اندوختہ پر زندگیاں بسر کرنے والے، اپنی نسلوں کو خدمت طاغوت کے لیے تیار کرنے والے محض اس بنیاد پر تقویٰ کے مدعی بنے بیٹھے ہیں کہ انھوں نے اوراد و نوافل کا اہتمام کر رکھا ہے اور ہر وقت ہاتھوں میں تسبیحیں لٹکائے پھرتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کی بھی اصلاح فرمائی ہے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم من يأخذ عنی هٰؤلاء الكلمات فيعمل بهن او يعلم من يعمل بهن قلت انا يا رسول الله فاخذ بيدی فعدّ خمسا فقال اتق المحارم تكن اعبد الناس الحديث

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کون مجھ سے یہ باتیں لے کر ان پر عمل کرے گا یا عمل کرنے والوں کو سکھائے گا؟ میں نے عرض کیا، میں یا رسول اللہ۔ آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور پانچ چیزیں گنائیں ان میں سے پہلی بات یہ تھی کہ محارم سے پرہیز کر، سب سے بڑا عابد بن جائے گا۔

عن جابر قال ذكر رجل عند رسول الله صلی الله عليه وسلم بعبادة واجتهاد وذكر آخر برعة فقال النبی صلعم لا تعدل بالرعة يعنی الورع (رواه الترمذی)

جابر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کی عبادت اور ذکر الٰہی میں سرگرمی کا ذکر کیا گیا اور ایک دوسرے شخص کے محرمات و مشتبہات سے اجتناب کا۔ آپ نے فرمایا کہ عبادت کو پرہیزگاری کے برابر نہ کرو۔

عن ابی هريرة قال قال رجل يا رسول الله ان فلانة تذكر من كثرة صلواتها وصيامها وصدقتها غير انها تؤذی جيرانها بلسانها قال هی فی النار قال يا رسول الله فان فلانة تذكر قلة صيامها وصدقتها وصلاتها وانها تصدق بالاثوار من الاقط ولا تؤذی بلسانها جيرانها قال هی فی الجنة (رواه احمد والبیہقی)

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا فلاں بی بی کے نماز اور روزے اور صدقہ کی بڑی دھوم ہے لیکن وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بدزبانی کرتی ہے۔ حضور نے فرمایا وہ جہنم میں پڑے گی۔ اس نے کہا یا رسول اللہ فلاں عورت کے روزے، صدقہ اور نماز کی کمی کی شکایت ہے۔ کچھ پنیر کے ٹکڑے صدقہ کردیتی ہے لیکن پڑوسیوں کے ساتھ بدزبانی نہیں کرتی۔ حضور نے فرمایا وہ جنت میں داخل ہوگی۔

بعض لوگ بعض مظاہر تقویٰ کو عین تقویٰ سمجھ بیٹھتے ہیں اور اپنا سارا زور انھی چیزوں پر صرف کرتے ہیں، مثلاً ازار کا ٹخنوں سے اونچا ہونا، داڑھی کا لمبا ہونا، لبوں کا تراشا ہوا ہونا۔ پھر اس فہرست میں اپنے جی سے کچھ اس کے اور مناسبات جمع کرلیتے ہیں، مثلاً صورت کی خستہ حالی، لباس کی بدوضعی، لب و لہجہ کی مصنوعی مسکینی، ملنے جلنے میں اظہار تذلل، اٹھنے بیٹھنے میں

نمائش تقویٰ اور قیام و قعود میں تکلف اظہار خشیت۔ ان کا تقویٰ بس انہی چیزوں سے عبارت ہوتا ہے اور انہی چیزوں کو تقویٰ کا پیمانہ بنا کر اسی سے دوسروں کو ناپتے ہیں اور جن کے اندر یہ باتیں اپنے معیار کے مطابق نہیں پاتے ان کو حقیر خیال کرنے لگتے ہیں حالانکہ بسا اوقات ان لوگوں کی زندگی جن کو یہ حقیر سمجھتے ہیں، حدود الٰہی کے احترام میں ان سے زیادہ متوازن ہوتی ہے لیکن چونکہ تقویٰ کی بعض اشکال میں یہ ان کے معیار پر نہیں ہوتے اس وجہ سے وہ لوگ ان کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے گھر کے چراغ کو اس کی مرکزی جگہ سے اتار کر کسی ایک گوشہ میں رکھدے اس کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوگا کہ گھر کا وہ گوشہ زیادہ روشن ہو جائے گا لیکن دوسرا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ بقیہ گھر بالکل تاریک ہو جائے گا۔ برعکس اس کے دوسرا شخص جو اپنے گھر کے چراغ کو اس کی مرکزی جگہ ہی پر رکھتا ہے اگرچہ اس کے گھر کا کوئی ایک گوشہ زیادہ منور نہیں ہوتا لیکن اس کے گھر کے تمام اطراف میں، روشنی ایک موزوں مقدار میں پھیلتی ہے۔ پس، جو لوگ بعض مظاہر تقویٰ کو عین تقویٰ سمجھ بیٹھتے ہیں وہ اپنے تقویٰ کے چراغ کو اپنے دل کے طاق سے، جو مرکز ہے، اتار کر اپنے جسم کے اطراف میں سے کسی گوشہ میں رکھ دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا وہ طرف تو، روشن ہو جاتا ہے لیکن بقیہ سارے اطراف میں وہی تاریکی ہوتی ہے جو ایک بے چراغ گھر میں ہوتی ہے۔ جو لوگ اس طرح کی غلط فہمی میں مبتلا تھے ان کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا کہ وہ تقویٰ کا مرکز اطراف و اعضا کو نہیں بلکہ دل کو بنائیں تاکہ تمام اطراف روشن ہوں اور ان لوگوں کو حقیر نہ خیال کریں جن کا کوئی ایک گوشہ ہر چند ان کی طرح روشن نہیں لیکن ان کے کسی گوشۂ زندگی میں ظلمت اور فساد نہیں ہے۔ اس روشنی میں حدیث ذیل پر غور فرمائیے۔

عن ابی ھریرۃ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یخذلہ ولا یحقرہ، التقوی ھھنا ویشیر الی صدرہ ثلث مرار بحسب امرئ من الشر ان یحقر اخاہ المسلم کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ

(رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرے، نہ اسے چھوڑے، نہ حقیر جانے، تقویٰ یہاں ہے (حضور نے دل کی طرف اشارہ فرمایا اور تین بار فرمایا) کسی شخص کی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانتا ہے۔ مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون بھی، اس کا مال بھی، اس کا ناموس بھی

یہ تقویٰ جس کا مرکز دل ہو، جو انسان کی زندگی کے تمام اطراف کو روشن کرے، جو ہر شعبۂ زندگی میں اس کو اللہ کے حدود کا پابند بنائے، جس میں کامل توافق ہو، کامل اعتدال ہو، پوری ہمہ گیری ہو، جو نہ ایک قدم اللہ کی حد سے آگے بڑھنے دے، نہ ایک قدم اس سے پیچھے ہٹنے پر راضی ہو، جو دل کو مجبور کرے کہ وہی سوچے جو سوچنا چاہیے آنکھوں کو مجبور کرے کہ وہی دیکھیں جو دیکھنا چاہیے، کانوں کی نگرانی کرے کہ وہی سنیں جو سننا چاہیے، زبان کی حفاظت

کرے کہ وہی بولے جو حق ہے، اور ہاتھ پاؤں کی دیکھ بھال کرے کہ اسی کام کے لیے اور اسی راہ میں اٹھیں جو اللہ نے انسان کے لیے کھولی ہے۔ بطن و فرج پر پہرہ بٹھا دے کہ یہ کسی حرام کو حلال یا کسی حلال کو حرام نہ کریں۔ جو خدا کی صحیح معرفت، آخرت کے سچے خوف، احکام الٰہی کے سچے جذبۂ احترام کے ساتھ ہو، جو انسان کے ظاہر میں بھی ہو، اور اس کے باطن میں بھی ہو، خلوت میں بھی ہو اور جلوت میں بھی ہو۔ یہ تقویٰ ہے جس کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ یہی تقویٰ ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو رونق و جمال بخشتا ہے۔ (اوصیک بتقوی اللہ فانہ ازین لامرک کلہ) یہی تقویٰ ہے جس کو قرآن میں لباس سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جس طرح لباس زندگی کو سردی و گرمی سے اور میدان جنگ میں خطرات سے بچاتا ہے اسی طرح یہ بھی انسان کو مادی و روحانی مہالک سے بچاتا ہے، جس طرح لباس انسان کی ستر پوشی کرتا ہے اسی طرح یہ بھی انسان کو معاصی سے بچا کر اس کی پردہ پوشی کرتا ہے اور پھر جس طرح لباس انسان کو زینت و جمال بخشتا ہے اسی طرح تقویٰ بھی انسان کی ساری زندگی کو سنوار دیتا ہے۔ یہی وہ تقویٰ ہے جس کی تعلیم دینے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذرؓ کو برابر چھ روز تک متنبہ کرتے رہے کہ غور سے سننا کچھ باتیں کہنی ہیں اور چھ روز کے بعد زبان حق ترجمان جو گویا ہوئی تو پہلی بات یہ ارشاد ہوئی کہ اوصیک بتقوی اللہ فی سر امرک وعلانیتہ۔

تفہیم القرآن

(۳۰)

التوبہ

(از رکوع ۶)

[۱] اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔[۲] تم نہ اٹھو گے تو خدا تمھیں دردناک سزا دے گا[۳] اور تمھاری جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا[۴] اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

---

[۱] سورۂ توبہ کا یہ حصہ اس زمانہ میں نازل ہوا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی تیاری فرما رہے تھے۔

[۲] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ عالمِ آخرت کی بے پایاں زندگی اور وہاں کے بے حد و حساب ساز و سامان کو جب تم دیکھو گے تب تمھیں معلوم ہوگا کہ دنیا کے تھوڑے سے عرصۂ حیات میں لطف اندوزی کے جو امکانات تم کو حاصل تھے اور زیادہ سے زیادہ جو اسبابِ عیش تم کو میسر تھے وہ ان غیر محدود امکانات اور اس نعیم و ملکِ کبیر کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے، اور اس وقت تم کو اپنی اس ناعاقبت اندیشی و کم نگاہی پر افسوس ہوگا کہ تم نے کیوں ہمارے سمجھانے کے باوجود دنیا کے عارضی اور قلیل منافع کی خاطر اپنے آپ کو ان ابدی اور کثیر منافع سے محروم کر لیا۔ دوسرے یہ کہ متاعِ حیاتِ دنیا آخرت میں کام آنے والی چیز نہیں ہے۔ یہاں تم خواہ کتنا ہی سروسامان مہیا کر لو، موت کی آخری ہچکی کے ساتھ ہر چیز سے تم کو دست بردار ہونا پڑے گا، اور سرحدِ موت کے دوسری جانب جو عالم ہے وہاں ان میں سے کوئی چیز بھی تمھارے ساتھ منتقل نہ ہوگی۔ وہاں اس کا کوئی حصہ اگر تم پا سکتے ہو تو صرف وہی جسے تم نے خدا کی رضا پر قربان کیا ہو اور جس کی محبت پر تم نے خدا اور اس کے دین کی محبت کو ترجیح دی ہو۔

[۳] اسی سے یہ مسئلہ نکلا ہے کہ جب تک نفیرِ عام (جنگی خدمت کے لیے عام بلاوا) نہ ہو، یا جب تک کسی علاقے کی مسلم آبادی یا مسلمانوں کے کسی گروہ کو جہاد کے لیے نکلنے کا حکم نہ دیا جائے، اس وقت تک تو جہاد فرضِ کفایہ رہتا ہے، یعنی اگر کچھ لوگ اسے ادا کرتے رہیں تو باقی لوگوں پر سے اس کی فرضیت ساقط ہے۔ لیکن جب امام المسلمین کی طرف سے مسلمانوں کو جہاد کا عام بلاوا ہو جائے، یا کسی خاص گروہ یا خاص علاقے کی آبادی کو بلاوا دے دیا جائے، تو پھر جنھیں بلاوا دیا گیا ہو ان پر جہاد فرضِ عین ہے، حتیٰ کہ جو شخص کسی حقیقی معذوری کے بغیر نہ نکلے اس کا ایمان تک معتبر نہیں ہے۔

[۴] یعنی خدا کا کام کچھ تم پر منحصر نہیں ہے کہ تم کرو گے تو وہ ہوگا ورنہ نہ ہوگا۔ درحقیقت یہ تو خدا کا فضل و احسان ہے کہ وہ تمھیں اپنے دین کی خدمت کا زریں موقع دے رہا ہے۔ اگر تم اپنی نادانی سے اس موقع کو کھو دو گے تو خدا کسی اور قوم کو اس کی توفیق بخش دے گا اور تم نامراد رہ جاؤ گے۔

وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں، اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔[1] اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکونِ قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دیا، اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے، اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے ــــ نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل[2] اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

اے نبی! اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمھارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے، مگر ان پر تو یہ راستہ بہت کٹھن ہو گیا۔[3] اب وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمھارے ساتھ چلتے! وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اے نبی! اللہ تمھیں معاف کرے، تم نے کیوں انھیں رخصت دیدی؟[4] (تمھیں چاہیے تھا کہ خود رخصت نہ دیتے) تاکہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔ جو لوگ سچے دل سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے

---

[1] یہ اس موقع کا ذکر ہے جب کفارِ مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا تہیہ کر لیا تھا اور آپ عین اُس رات کو، جو قتل کے لیے مقرر کی گئی تھی، مکہ سے نکل کر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد دو دو چار چار کر کے پہلے ہی مدینہ جا چکی تھی۔ مکہ میں صرف وہی مسلمان رہ گئے تھے جو بالکل بے بس تھے یا منافقانہ ایمان رکھتے تھے اور ان پر کوئی بھروسہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس حالت میں جب آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا ہے تو آپ صرف ایک رفیق، حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر مکہ سے نکلے، اور اس خیال سے کہ آپ کا تعاقب ضرور کیا جائے گا، آپ نے مدینہ کی راہ چھوڑ کر، جو شمال کی جانب تھی، جنوب کی راہ اختیار کی۔ یہاں تین دن تک آپ غارِ ثور میں چھپے رہے۔ خون کے پیاسے دشمن آپ کو ہر طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اطرافِ مکہ کی وادیوں کا کوئی گوشہ انھوں نے ایسا نہ چھوڑا جہاں آپ کو تلاش نہ کیا ہو۔ اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ ان میں سے چند لوگ عین اس غار کے دہانے پر بھی پہنچ گئے جس میں آپ چھپے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کو سخت خوف لاحق ہوا کہ اگر ان لوگوں میں سے کسی نے ذرا آگے بڑھ کر غار میں جھانک لیا تو وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اطمینان میں ذرا فرق نہ آیا اور آپ نے یہ کہہ کر حضرت ابوبکرؓ کو تسکین دی کہ "غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔

[2] ہلکے اور بوجھل کے الفاظ بہت وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب نکلنے کا حکم ہو چکا ہے تو بہرحال تم کو نکلنا چاہیے خواہ برضا و رغبت خواہ بکراہت، خواہ خوشحالی میں خواہ تنگ دستی میں، خواہ ساز و سامان کی کثرت کے ساتھ خواہ بے سروسامانی کے ساتھ، خواہ موافق حالات میں خواہ ناموافق حالات میں، خواہ جوان و تندرست خواہ ضعیف و کمزور۔

[3] یعنی یہ دیکھ کر کہ مقابلہ روم جیسی طاقت سے ہے، اور زمانہ شدید گرمی کا ہے، اور ملک میں قحط برپا ہے، اور نئے سال کی فصلیں، جن سے آس لگی ہوئی تھی، کٹنے کے قریب ہیں، ان کو تبوک کا سفر بہت ہی گراں محسوس ہونے لگا۔

[4] بعض منافقین نے بناوٹی عذرات پیش کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت مانگی تھی، اور حضور نے بھی اپنے طبعی حلم کی بنا پر یہ جاننے کے باوجود کہ وہ محض بہانے کر رہے ہیں ان کو رخصت عطا فرما دی تھی۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا اور آپ کو تنبیہ کی کہ ایسی نرمی مناسب نہیں ہے۔ رخصت دیدینے کی وجہ سے ان منافقوں کو اپنے نفاق پر پردہ ڈالنے کا موقع مل گیا۔ اگر انھیں رخصت نہ دی جاتی اور پھر یہ گھر بیٹھے رہتے تو ان کا جھوٹا دعوائے ایمان بے نقاب ہو جاتا۔

یہ درخواست نہ کریں گے کہ انھیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے، اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں۔[۵۱]

اگر واقعی ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو وہ اس کے لیے کچھ تیاری کرتے، لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہ تھا[۵۲] اس لیے اس نے انھیں سست کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ اگر وہ تمھارے ساتھ نکلتے تو تمھارے اندر خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ وہ تمھارے درمیان فتنہ پردازی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے، اور تمھارے گروہ کا حال یہ ہے کہ ابھی اُس میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں، اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمھیں ناکام کرنے کے لیے یہ ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آ گیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا۔

ان میں سے کوئی ہے جو کہتا ہے کہ "مجھے رخصت دے دیجیے اور مجھ کو فتنہ میں نہ ڈالیے"[۵۳] ــــ سن رکھو! فتنے ہی میں تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں[۵۴] اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے۔[۵۵]

تمھارا بھلا ہوتا ہے تو انھیں رنج ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ منہ پھیر کر خوش خوش پلٹتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کر لیا تھا۔ ان سے کہو "ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے

---

۵۱ اس سے معلوم ہوا کہ کفر و اسلام کی کشمکش ایک کسوٹی ہے جو کھرے مومن اور کھوٹے مدعی ایمان کے فرق کو صاف کھول کر رکھ دیتی ہے۔ جو شخص اس کشمکش میں دل و جان سے اسلام کی حمایت کرے اور اپنی ساری طاقت اور تمام ذرائع اس کو سربلند کرنے کی سعی میں کھپا دے اور کسی قربانی سے دریغ نہ کرے وہی سچا مومن ہے۔ بخلاف اس کے جو اس کشمکش میں اسلام کا ساتھ دینے سے جی چرائے اور کفر کی سربلندی کا خطرہ سامنے دیکھتے ہوئے بھی اسلام کی سربلندی کے لیے جان و مال کی بازی کھیلنے سے پہلو تہی کرے، اس کی یہ روش خود اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔

۵۲ یعنی بادلِ ناخواستہ اٹھنا اللہ کو پسند نہ تھا۔ کیونکہ جب وہ شرکتِ جہاد کے جذبہ اور نیت سے خالی تھے اور ان میں اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جانفشانی کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی، تو وہ صرف مسلمانوں کی شرما شرمی سے بددلی کے ساتھ یا کسی شرارت کی نیت سے مستعدی کے ساتھ اٹھتے اور یہ چیز ہزار خرابیوں کی موجب ہوتی جیسا کہ بعد والی آیت میں بتصریح فرما دیا گیا ہے۔ ۵۳ جو منافق بہانہ کر کے پیچھے ٹھیر جانے کی اجازت مانگ رہے تھے ان میں سے بعض ایسے بےباک بھی تھے جو اللہ کی راہ سے قدم پیچھے ہٹانے کے لیے مذہبی و اخلاقی نوعیت کے بہانے تراشتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص جد بن قیس کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ میں ایک حسن پرست آدمی ہوں، میری قوم کے لوگ میری اس کمزوری سے واقف ہیں کہ عورت کے معاملہ میں مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں رومی عورتوں کو دیکھ کر میرا قدم پھسل نہ جائے۔ لہٰذا آپ مجھے فتنہ میں نہ ڈالیں اور اس جہاد کی شرکت سے مجھ کو معذور رکھیں۔

۵۴ یعنی نام تو فتنے سے بچنے کا لیتے ہیں مگر درحقیقت نفاق اور جھوٹ اور ریاکاری کا فتنہ بری طرح ان پر مسلط ہے۔ اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے فتنوں کے امکان پر پریشانی و خوف کا اظہار کر کے یہ بڑے متقی ثابت ہوئے جا رہے ہیں، حالانکہ فی الواقع کفر و اسلام کی فیصلہ کن کشمکش کے موقع پر اسلام کی حمایت سے پہلو تہی کر کے یہ اتنے بڑے فتنے میں مبتلا ہو رہے ہیں جس سے بڑھ کر کسی فتنہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ۵۵ یعنی تقویٰ کی اس نمائش نے ان کو جہنم سے دور نہیں کیا بلکہ نفاق کی اس لعنت نے انھیں جہنم کے چنگل میں الٹا پھنسا دیا۔

لیے لکھ دی ہے، اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہلِ ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔"[1]
ان سے کہو، "تم ہمارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے۔[2]
اور ہم تمہارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ خود تم کو سزا دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں دلواتا ہے؟ اچھا تو اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔"

---

[1] یہاں دنیا پرست اور خدا پرست کی ذہنیت کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ دنیا پرست جو کچھ کرتا ہے اپنے نفس کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کے نفس کی خوشی بعض دنیوی مقاصد کے حصول پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ مقاصد اسے حاصل ہو جائیں تو وہ پھول جاتا ہے اور حاصل نہ ہوں تو اس پر مردنی چھا جاتی ہے۔ پھر اس کا سہارا تمام تر مادی اسباب پر ہوتا ہے، وہ سازگار ہوں تو اس کا دل بڑھنے لگتا ہے اور ناسازگار ہوتے نظر آئیں تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ بخلاف اس کے خدا پرست انسان جو کچھ کرتا ہے اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کام میں اس کا بھروسہ اپنی قوت یا مادی اسباب پر نہیں بلکہ اللہ کی ذات پر ہوتا ہے۔ راہِ حق میں کام کرتے ہوئے اس پر مصائب نازل ہوں یا کامرانیوں کی بارش ہو، دونوں صورتوں میں وہ یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ اللہ کی مرضی ہے وہ پوری ہو رہی ہے۔ مصائب اس کا دل نہیں توڑ سکتے اور کامیابیاں اس کو اتراہٹ میں مبتلا نہیں کر سکتیں، کیونکہ اول تو دونوں کو وہ اپنے حق میں خدا کی طرف سے ایک آزمائش سمجھتا ہے اور اسے ہر حال میں یہ فکر ہوتی ہے کہ خدا کی ڈالی ہوئی اس آزمائش سے بخیریت گزر جاؤں، دوسرے اس کے پیشِ نظر دنیوی مقاصد نہیں ہوتے کہ ان کے لحاظ سے وہ اپنی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ کرے، بلکہ اس کے سامنے رضائے الٰہی کا مقصد وحید ہوتا ہے اور اس مقصد سے اس کے قریب یا دور ہونے کا پیمانہ کسی دنیوی کامیابی کا حصول یا عدمِ حصول نہیں ہے بلکہ صرف یہ امر ہے کہ راہِ خدا میں جان و مال کی بازی لگانے کا جو فرض اس پر عائد ہوتا تھا اسے اس نے کہاں تک انجام دیا۔ اگر یہ فرض اس نے ادا کر دیا ہو تو خواہ دنیا میں اس کی بازی بالکل ہی ہر گئی ہو، لیکن اسے پورا بھروسہ رہتا ہے کہ جس خدا کے لیے اس نے مال کھپایا اور جان دی ہے وہ اس کے اجر کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ پھر دنیوی اسباب سے وہ آس ہی نہیں لگاتا کہ ان کی سازگاری یا ناسازگاری اس کو خوش یا رنجیدہ کرے، بلکہ اس کا سارا اعتماد خدا پر ہوتا ہے جو عالمِ اسباب کا حاکم ہے اور اس کے اعتماد پر وہ ناسازگار حالات میں بھی اسی عزم و ہمت کے ساتھ کام کیے جاتا ہے جس کا اظہار اہلِ دنیا سے صرف سازگار حالات ہی میں ہوا کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان دنیا پرست منافقین سے کہہ دو کہ ہمارا معاملہ تمہارے معاملہ سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ تمہاری خوشی و رنج کے قوانین کچھ اور ہیں اور ہمارے کچھ اور۔ تم اطمینان اور بے اطمینانی کسی اور ماخذ سے لیتے ہو اور ہم کسی اور ماخذ سے۔

[2] منافقین حسبِ عادت اس موقع پر بھی کفر و اسلام کی اس کشمکش میں حصہ لینے کے بجائے، اپنی دانست میں کمالِ دانشمندی کے ساتھ، دور بیٹھے ہوئے یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کشمکش کا انجام کیا ہوتا ہے، رسول اور اصحابِ رسول فتحیاب ہو کر آتے ہیں یا رومیوں کی فوجی طاقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اس کا جواب انھیں یہ دیا گیا کہ جن دو نتیجوں میں سے ایک کے ظہور کا تمہیں انتظار ہے، اہلِ ایمان کے لیے تو وہ دونوں ہی سراسر بھلائی ہیں۔ وہ اگر فتحیاب ہوں تو اس کا بھلائی ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ لیکن اگر اپنے مقصد کی راہ میں جانیں لڑاتے ہوئے وہ سب کے سب پیوندِ خاک ہو جائیں تب بھی دنیا کی نگاہ میں چاہے یہ انتہائی ناکامی ہو مگر حقیقت میں یہ بھی ایک دوسری کامیابی ہے، اس لیے کہ مومن کی کامیابی و ناکامی کا معیار یہ نہیں ہے کہ اس نے کوئی ملک فتح کیا یا نہیں یا کوئی حکومت قائم کر دی یا نہیں، بلکہ اس کا معیار یہ ہے کہ اس نے اپنے خدا کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے اپنے دل و دماغ اور جسم و جان کی ساری قوتیں لڑا دیں یا نہیں۔ یہ کام اگر اس نے کر دیا تو درحقیقت کامیاب ہے خواہ دنیا کے اعتبار سے اس کی سعی کا نتیجہ صفر ہی کیوں نہ ہو۔

ان سے کہو "تم اپنے مال خواہ راضی خوشی خرچ کرو یا بکراہت،[1] بہرحال وہ قبول نہ کیے جائیں گے کیونکہ تم فاسق لوگ ہو"۔ ان کے دیے ہوئے مال قبول نہ ہونے کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا ہے، نماز کیلیے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو بادل ناخواستہ خرچ کرتے ہیں۔ ان کے مال و دولت اور ان کی کثرت اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ، اللہ تو ان چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی ہی میں مبتلائے عذاب کرنے والا ہے[2] اور یہ جان بھی دیں گے تو انکار حق ہی کی حالت میں دیں گے۔[3]

وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہی میں سے ہیں، حالانکہ وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں۔ اصل میں تو وہ ایسے لوگ ہیں جو تم سے خوف زدہ ہیں۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ پالیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں۔[4]

---

[1] بعض منافق ایسے بھی تھے جو اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تو تیار نہ تھے، مگر یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ اس جہاد اور اس کی سعی سے بالکل کنارہ کش رہ کر مسلمانوں کی نگاہ میں اپنی وقعت کھو دیں اور اپنے نفاق کو علانیہ ظاہر کر دیں۔ اس لیے وہ کہتے تھے کہ ہم جنگی خدمت انجام دینے سے تو اس وقت معذور چاہتے ہیں لیکن مال سے مدد کرنے کے لیے حاضر ہیں۔

[2] یعنی اس مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہو کر جو منافقانہ رویہ انھوں نے اختیار کیا ہے، اس کی وجہ سے مسلم سوسائٹی میں یہ انتہائی ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے اور وہ ساری شان ریاست، عزت و ناموری اور مشیخت و چودھراہٹ جو اب تک عربی سوسائٹی میں ان کو حاصل رہی ہے، نئے اسلامی نظام اجتماعی میں وہ خاک میں مل جائے گی۔ ادنیٰ ادنیٰ غلام اور غلام زادے اور معمولی کاشتکار اور چرواہے، جنھوں نے اخلاص ایمانی کا ثبوت دیا ہے، اس نئے نظام میں باعزت ہوں گے، اور یہ خاندانی چودھری اپنی دنیا پرستی کی بدولت بے عزت ہو کر رہ جائیں گے۔

[3] یعنی اس ذلت و رسوائی سے بڑھ کر مصیبت ان کے لیے یہ ہوگی کہ جن منافقانہ اوصاف کو یہ اپنے اندر پرورش کر رہے ہیں ان کی بدولت انھیں مرتے دم تک صدق ایمانی کی توفیق نصیب نہ ہوگی اور اپنی دنیا خراب کر لینے کے بعد یہ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوں گے کہ آخرت بھی خراب بلکہ خراب تر ہوگی۔

[4] مدینہ کے یہ منافق زیادہ تر بلکہ تمام تر مالدار اور سن رسیدہ لوگ تھے۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان کی جو فہرست دی ہے اس میں صرف ایک نوجوان کا ذکر ملتا ہے اور غریب ان میں سے کوئی بھی نہیں ـــــ یہ لوگ مدینہ میں جائدادیں اور پھیلے ہوئے کاروبار رکھتے تھے اور جہاندیدگی نے ان کو مصلحت پرست بنا دیا تھا۔ اسلام جب مدینہ پہنچا اور آبادی کے ایک بڑے حصہ نے پورے اخلاص اور جوش ایمانی کے ساتھ اسے قبول کر لیا، تو ان لوگوں نے اپنے آپ کو ایک عجیب مخمصہ میں مبتلا پایا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک طرف تو خود ان کے اپنے قبیلوں کی اکثریت بلکہ ان کے بیٹوں اور بیٹیوں تک کو اس نئے دین نے ایمان کے نشے سے سرشار کر دیا ہے اور ان کے خلاف اگر وہ کفر و انکار پر قائم رہتے ہیں تو ان کی ریاست، عزت، شہرت سب خاک میں مل جاتی ہے حتیٰ کہ ان کے اپنے گھروں میں ان کے خلاف بغاوت برپا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ دوسری طرف اس دین کا ساتھ دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ سارے عرب بلکہ اطراف و نواح کی قوموں اور سلطنتوں سے بھی لڑائی مول لینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اغراض نفسانی کی بندگی نے معاملہ کے اس پہلو پر نظر کرنے کی استعداد تو ان کے اندر باقی ہی نہیں رہنے دی تھی کہ حق اور صداقت بجائے خود بھی کوئی قیمتی چیز ہے جس کے عشق میں انسان خطرات مول لے سکتا ہے اور جان و مال کی قربانیاں گوارا کر سکتا ہے۔ وہ دنیا کے سارے معاملات و مسائل پر صرف مفاد اور مصلحت ہی کے لحاظ سے نگاہ ڈالنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کو اپنے مفاد کے تحفظ کی بہترین صورت یہی نظر آئی کہ ایمان کا دعویٰ کریں تاکہ اپنی قوم کے درمیان اپنی ظاہری عزت اور اپنی (باقی حاشیہ صفحہ ۱۸)

اے نبی! ان میں سے بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراضات کرتے ہیں۔ اگر اس مال میں سے انھیں کچھ دے دیا[۵۸] جائے تو خوش ہو جائیں، اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں۔[۵۹] کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول نے جو کچھ بھی انھیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ "اللہ ہمارے لیے کافی ہے، وہ اپنے فضل سے ہمیں اور بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی ہم پر عنایت فرمائے گا، ہم اللہ ہی کی طرف نظر جمائے ہوئے ہیں۔"[۶۰] یہ صدقات تو دراصل فقیروں[۶۱] اور مسکینوں[۶۲] کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) جائدادوں اور اپنے کاروبار کو برقرار رکھ سکیں، مگر مخلصانہ ایمان نہ اختیار کریں تاکہ اُن خطرات و نقصانات سے دوچار نہ ہوں جو اخلاص کی راہ اختیار کرنے سے لازماً پیش آنے تھے۔ ان کی اسی ذہنی کیفیت کو یہاں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حقیقت میں یہ لوگ تمہارے ساتھ نہیں ہیں بلکہ نقصانات کے خوف نے انھیں زبردستی تمہارے ساتھ باندھ دیا ہے۔ جو چیز انھیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرائیں وہ صرف یہ خوف ہے کہ مدینہ میں رہتے ہوئے علانیہ غیر مسلم ہوں تو جاہ و منزلت ختم ہوتی ہے اور بیوی بچوں تک سے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ مدینہ کو چھوڑ دیں تو اپنی جائدادوں اور تجارتوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اور ان کے اندر کفر کے لیے بھی اتنا اخلاص نہیں ہے کہ اس کی خاطر وہ ان نقصانات کو برداشت کرنے پر تیار ہو جائیں۔ اس مخمصے نے انھیں کچھ ایسا پھانس رکھا ہے کہ مجبوراً مدینہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، بادلِ ناخواستہ نمازیں پڑھ رہے ہیں اور زکوٰۃ کا جرمانہ بھگت رہے ہیں۔ ورنہ آئے دن جہاد اور آئے دن کسی نہ کسی خوفناک دشمن کے مقابلے اور آئے دن جان و مال کی قربانیوں کے مطالبے کی جو مصیبت ان پر پڑی ہوئی ہے اس سے بچنے کے لیے یہ اس قدر بے چین ہیں کہ اگر کوئی سوراخ یا بِل بھی ایسا نظر آ جائے جس میں انھیں امن ملنے کی امید ہو تو یہ بھاگ کر اس میں گھس بیٹھیں۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۵۸] عرب میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کے تمام ان باشندوں پر، جو ایک مقرر مقدار سے زائد مال رکھتے تھے، باقاعدہ زکوٰۃ عائد کی گئی تھی اور وہ ان کی زرعی پیداوار سے، ان کے مویشیوں سے، ان کے اموالِ تجارت سے، ان کے معادن اور دفینوں سے اور ان کے سونے چاندی کے ذخائر سے ۲ ۱/۲ فیصدی، ۵ فیصدی، ۱۰ فیصدی اور ۲۰ فیصدی کی مختلف شرحوں کے مطابق وصول کی جاتی تھی۔ یہ سب اموالِ زکوٰۃ ایک منظم طریقہ سے وصول کیے جاتے اور ایک مرکز پر جمع ہو کر منظم طریقہ سے خرچ کیے جاتے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ملک کے اطراف سے اتنی دولت سمٹ کر آتی اور آپ کے ہاتھوں خرچ ہوتی تھی جو عرب کے لوگوں نے کبھی اس سے پہلے کسی ایک شخص کے ہاتھوں جمع اور تقسیم ہوتے نہیں دیکھی تھی۔ دنیا پرست منافقین کے منہ میں اس دولت کو دیکھ کر پانی بھر آتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بہتے ہوئے دریا سے ان کو خوب سیر ہو کر پینے کا موقع ملے۔ مگر یہاں پلانے والا خود اپنے اوپر اور اپنے متعلقین پر اس دریا کے ایک ایک قطرے کو حرام کر چکا تھا اور کوئی یہ توقع نہ کر سکتا تھا کہ اس کے ہاتھوں سے مستحق لوگوں کے سوا کسی اور کے لب تک جام پہنچ سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم صدقات کو دیکھ دیکھ کر دلوں میں گھٹتے تھے اور ہر تقسیم کے موقع پر آپ کو طرح طرح کے الزامات سے مطعون کرتے تھے۔ دراصل شکایت تو انھیں یہ تھی کہ اس مال پر ہمیں دست درازی کا موقع نہیں دیا جاتا۔ مگر اس حقیقی شکایت کو چھپا کر وہ الزام یہ رکھتے تھے کہ مال کی تقسیم انصاف سے نہیں کی جاتی اور اس میں جانب داری سے کام لیا جاتا ہے۔ [۵۹] یعنی مالِ غنیمت میں جو حصہ یہ لوگ پاتے رہے ہیں اس پر قانع رہتے، اور خدا کے فضل سے جو کچھ یہ کماتے ہیں اور خدا کے دیے ہوئے ذرائع آمدنی سے جو خوشحالی انھیں میسر ہے اس کو اپنے لیے کافی سمجھتے۔ [۶۰] یعنی زکوٰۃ کے علاوہ جو اموال حکومت کے خزانے میں آئیں گے اُن سے حسبِ استحقاق ان لوگوں کو اسی طرح استفادہ کا موقع حاصل رہے گا جس طرح اب تک رہا ہے۔ [۶۱] یعنی ہماری نظر دنیا اور اس کی متاع حقیر پر نہیں بلکہ اللہ اور اس کے فضل و کرم پر ہے۔ اسی کی خوشنودی ہم چاہتے ہیں، اسی سے امید رکھتے ہیں، اور جو کچھ وہ دے اُس پر راضی ہیں۔ [۶۲] فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی معیشت کے لیے دوسرے کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لیے عام ہے خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاجِ اعانت ہو گئے ہوں، یا کسی عارضی سبب سے سرِدست مدد کے محتاج ہوں اور اگر انھیں سہارا مل جائے تو آگے چل کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہوں، مثلاً یتیم بچے، بیوہ عورتیں، (باقی حاشیہ صفحہ ۱۸)

جو صدقات کے کام پر مامور ہوں [۵۱]، اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو [۵۲]، نیز یہ گردنوں کے چھڑانے [۵۳] اور قرض داروں کی مدد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) بے روزگار لوگ اور وہ لوگ جو وقتی حوادث کے شکار ہو گئے ہوں۔ [۵۰] مسکنت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بے چارگی اور ذلت کے مفہومات شامل ہیں اور اس اعتبار سے مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ایسے لوگوں کو مستحقِ امداد ٹھیرایا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پا رہے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں، مگر نہ تو ان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انھیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ چنانچہ حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے کہ المسکین الذی لا یجد غنی یغنیہ ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ ولا یقوم فیسأل الناس "مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا، اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے، اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے۔"

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۵۱] یعنی وہ لوگ جو صدقات وصول کرنے اور وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے اور ان کا حساب کتاب لکھنے اور انھیں تقسیم کرنے میں حکومت کی طرف سے استعمال کیے جائیں۔ ایسے لوگ خواہ فقیر و مسکین نہ ہوں، ان کی تنخواہیں بہرحال صدقات ہی کی مد سے دی جائیں گی۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات اور اپنے خاندان (یعنی بنی ہاشم) پر زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے خود بھی صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام ہمیشہ بلا معاوضہ کیا، اور دوسرے بنی ہاشم کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ اگر وہ اس خدمت کو بلا معاوضہ انجام دیں تو جائز ہے، لیکن معاوضہ لے کر اس شعبے کی کوئی خدمت کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ آپ کے خاندان کے لوگ اگر صاحبِ نصاب ہوں تو زکوٰۃ دینا ان پر فرض ہے، لیکن اگر وہ غریب و محتاج یا قرض دار یا مسافر ہوں تو زکوٰۃ لینا ان کے لیے حرام ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ خود بنی ہاشم کی زکوٰۃ بھی بنی ہاشم لے سکتے ہیں یا نہیں۔ امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ لے سکتے ہیں، لیکن اکثر فقہا اس کو بھی جائز نہیں رکھتے۔

[۵۲] تالیفِ قلب کے معنی ہیں دل موہنا۔ اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوشِ عداوت کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہو، یا جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر مال سے انھیں توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہوں، یا جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں اور ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی استمالت نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے، ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عطیے دے کر اسلام کا حامی و مددگار یا مطیع و فرماں بردار یا کم از کم بے ضرر دشمن بنا لیا جائے۔ اس مد پر غنائم اور دوسرے ذرائعِ آمدنی سے بھی مال خرچ کیا جا سکتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو زکوٰۃ کی مد سے بھی۔ اور ایسے لوگوں کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ فقیر و مسکین یا مسافر ہوں تب ہی ان کی مدد زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہو، بلکہ وہ مالدار اور رئیس ہوتے ہوئے بھی زکوٰۃ دیے جانے کے مستحق ہیں۔

یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے لوگوں کو تالیفِ قلب کے لیے وظیفے اور عطیے دیے جاتے تھے۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہو گیا ہے کہ آیا آپ کے بعد بھی یہ مد باقی رہی یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے سے یہ مد ساقط ہو گئی ہے اور اب مؤلفۃ القلوب کو کچھ دینا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ فاسق مسلمانوں کو تالیفِ قلب کے لیے زکوٰۃ کی مد سے دیا جا سکتا ہے مگر کفار کو نہیں۔ اور بعض دوسرے فقہا کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کا حصہ اب بھی باقی ہے اگر اس کی ضرورت ہو۔

حنفیہ کا استدلال اس واقعہ سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عُیینہ بن حِصن اور اقرع بن حابس حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور انھوں نے ایک زمین آپ سے طلب کی۔ آپ نے ان کو عطیہ کا فرمان لکھ دیا۔ انھوں نے چاہا کہ مزید پختگی کے لیے دوسرے اعیانِ صحابہ بھی اس فرمان پر گواہیاں ثبت کر دیں۔ چنانچہ

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۹ پر)

کرنے میں[۱] اور راہ خدا میں[۲] اور مسافر نوازی میں[۳] استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) گواہیاں بھی ہوگئیں۔ مگر جب یہ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس گواہی لینے گئے تو انھوں نے فرمان کو پڑھ کر اسے ان کی آنکھوں کے سامنے چاک کر دیا اور ان سے کہا کہ بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی تالیف قلب کے لیے تمھیں دیا کرتے تھے، مگر وہ اسلام کی کمزوری کا زمانہ تھا۔ اب اللہ نے اسلام کو تم جیسے لوگوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس پر وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس شکایت لے کر آئے اور آپ کو طعنہ بھی دیا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ؟ لیکن نہ تو حضرت ابوبکرؓ ہی نے اس پر کوئی نوٹس لیا اور نہ ہی دوسرے صحابہ میں سے کسی نے حضرت عمرؓ کی اس رائے سے اختلاف کیا۔ اس سے حنفیہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ جب مسلمان کثیر التعداد ہو گئے اور ان کو یہ طاقت حاصل ہو گئی کہ اپنے بل بوتے پر کھڑے ہو سکیں تو وہ سبب باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے ابتداءً مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا گیا تھا، اس لیے باجماعِ صحابہ یہ حصہ ہمیشہ کے لیے ساقط ہو گیا۔

امام شافعیؒ کا استدلال یہ ہے کہ تالیف قلب کے لیے کفار کو مال زکوٰۃ دینا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت نہیں ہے۔ جتنے واقعات حدیث میں ہم کو ملتے ہیں، ان سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے کفار کو تالیف قلب کے لیے جو کچھ دیا وہ مال غنیمت سے دیا نہ کہ مال زکوٰۃ سے۔

ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ قیامت تک کے لیے ساقط ہو جانے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلا شبہ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ بالکل صحیح تھا۔ اگر اسلامی حکومت تالیف قلب کے لیے مال صرف کرنے کی ضرورت نہ سمجھتی ہو تو کسی نے اس پر فرض نہیں کیا ہے کہ ضرور ہی اس مد میں کچھ نہ کچھ صرف کرے۔ لیکن اگر کسی وقت اس کی ضرورت محسوس ہو، تو اللہ نے اس کے لیے جو گنجائش رکھی ہے اسے باقی رہنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کرام کا اجماع جس امر پر ہوا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ان کے زمانہ میں جو حالات تھے ان میں تالیف قلب کے لیے کسی کو کچھ دینے کی وہ حضرات ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ صحابہ کے اجماع نے اُس مد کو قیامت تک کے لیے ساقط کر دیا جو قرآن میں بعض اہم مصالح دینی کے لیے رکھی گئی تھی۔

رہی امام شافعیؒ کی رائے تو وہ اس حد تک تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب حکومت کے پاس دوسری مدات آمدنی سے کافی مال موجود ہو تو اسے تالیف قلب کی مد پر زکوٰۃ کا مال صرف نہ کرنا چاہیے، لیکن جب زکوٰۃ کے مال سے اس کام میں مدد لینے کی ضرورت پیش آ جائے تو پھر یہ تفریق کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ فاسقوں پر اسے صرف کیا جائے اور کافروں پر نہ کیا جائے، اس لیے کہ قرآن میں مؤلفۃ القلوب کا جو حصہ رکھا گیا ہے وہ ان کے دعوائے ایمان کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ اسلام کو اپنے مصالح کے لیے ان کی تالیف قلب مطلوب ہے اور وہ اس قسم کے لوگ ہیں کہ ان کی تالیف قلب صرف مال کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ حاجت اور یہ صفت جہاں بھی متحقق ہو وہاں امام المسلمین بشرط ضرورت زکوٰۃ کا مال صرف کرنے کا از روئے قرآن مجاز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اس مد سے کفار کو کچھ نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے پاس دوسری مدات کا مال موجود تھا۔ ورنہ اگر آپ کے نزدیک کفار پر اس مد کا مال صرف کرنا جائز نہ ہوتا تو آپ اس کی تصریح فرماتے۔ [۵] گردنیں چھڑانے سے مراد یہ ہے کہ غلاموں کی آزادی میں زکوٰۃ کا مال صرف کیا جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس غلام نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کر لیا ہو کہ اگر میں اتنی رقم تمھیں ادا کر دوں تو تم مجھے آزاد کر دو، اسے آزادی کی قیمت ادا کرنے میں مدد دی جائے۔ دوسرے یہ کہ خود زکوٰۃ کی مد سے غلام خرید کر آزاد کیے جائیں۔ ان میں سے پہلی صورت پر تو سب فقہا متفق ہیں۔ لیکن دوسری صورت کو حضرت علیؓ، سعید بن جبیرؒ، لیثؒ، ثوریؒ، ابراہیم نخعیؒ، شعبیؒ، محمد بن سیرینؒ، حنفیہ اور شافعیہ ناجائز کہتے ہیں، اور ابن عباسؓ، حسن بصریؒ، مالکؒ، احمدؒ اور ابو ثورؒ جائز قرار دیتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] یعنی ایسے قرض دار جو اگر اپنے مال سے اپنا پورا قرض چکا دیں تو ان کے پاس قدرِ نصاب سے کم مال بچ سکتا ہو۔ وہ خواہ کمانے والے ہوں یا بے روزگار، اور خواہ عرفِ عام میں فقیر سمجھے جاتے ہوں یا غنی، دونوں صورتوں میں ان کی اعانت زکوٰۃ کی مد سے کی جا سکتی ہے۔ مگر متعدد فقہا کی رائے یہ ہے کہ جس شخص نے بداعمالیوں اور فضول خرچیوں میں اپنا مال اڑا کر اپنے آپ کو قرضداری میں مبتلا کیا ہو اس کی مدد نہ کی جائے جب تک وہ توبہ نہ کر لے۔

(حاشیہ ۲ و ۳ صفحہ ۲۰ پر)

جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

ان میں کچھ لوگ ہیں جو اپنی باتوں سے نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔[1] کہو، "وہ تمہاری بھلائی کے لیے ایسا ہے۔[2] اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہلِ ایمان پر اعتماد کرتا ہے[3] اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو تم میں سے ایماندار

(حاشیہ ۲، ۳ صفحہ ۱۹) [2] راہِ خدا کا لفظ عام ہے۔ تمام وہ نیکی کے کام جن میں اللہ کی رضا ہو، اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں پر صرف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے، اور ائمہ سلف کی بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی وہ جدوجہد جس سے مقصود نظامِ کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظامِ اسلامی کو قائم کرنا ہو۔ اس جدوجہد میں جو لوگ کام کریں ان کو سفر خرچ کے لیے، سواری کے لیے، آلات و اسلحہ اور سر و سامان کی فراہمی کے لیے زکوٰۃ سے مدد دی جا سکتی ہے خواہ وہ بجائے خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اسی طرح جو لوگ رضاکارانہ اپنی تمام خدمات اور اپنا تمام وقت، عارضی طور پر یا مستقل طور پر اس کام کے لیے دے دیں ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی زکوٰۃ سے وقتی یا استمراری اعانتیں دی جا سکتی ہیں۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ ائمہ سلف کے کلام میں بالعموم اس موقع پر غزوہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو قتال کا ہم معنی ہے۔ اس لیے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف میں فی سبیل اللہ کی جو مد رکھی گئی ہے وہ صرف قتال کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ، قتال سے وسیع تر چیز کا نام ہے اور اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے جو کلمۂ کفر کو پست اور کلمۂ خدا کو بلند کرنے اور اللہ کے دین کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کے لیے کی جائیں، خواہ وہ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی مرحلے میں ہوں یا قتال کے آخری مرحلے میں۔

[3] مسافر خواہ اپنے گھر میں غنی ہو لیکن حالتِ سفر میں اگر وہ مدد کا محتاج ہو جائے تو اس کی مدد زکوٰۃ کی مد سے کی جائے گی۔

یہاں بعض فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ جس شخص کا سفر معصیت کے لیے نہ ہو صرف وہی اس آیت کی رو سے مدد کا مستحق ہے۔ مگر قرآن و حدیث میں ایسی کوئی شرط موجود نہیں ہے، اور دین کی اصولی تعلیمات سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مدد کا محتاج ہو اس کی دستگیری کرنے میں اس کی گناہگاری مانع نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ فی الواقع گناہگاروں اور اخلاقی پستی میں گرے ہوئے لوگوں کی اصلاح کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ مصیبت کے وقت ان کو سہارا دیا جائے اور حسنِ سلوک سے ان کے نفس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جن عیوب سے متہم کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بات بھی تھی کہ حضور ہر شخص کی سن لیتے تھے اور ہر ایک کو اپنی بات کہنے کا موقع دیا کرتے تھے۔ یہ خوبی ان کی نگاہ میں عیب تھی۔ کہتے تھے کہ آپ کانوں کے کچے ہیں، جس کا جی چاہتا ہے آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے جس طرح چاہتا ہے آپ کے کان بھرتا ہے، اور آپ اس کی بات مان لیتے ہیں۔ اس الزام کا چرچا زیادہ تر اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ سچے اہلِ ایمان ان منافقین کی سازشوں اور ان کی شرارتوں، اور ان کی مخالفانہ گفتگوؤں کا حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا کرتے تھے اور اس پر یہ لوگ بگڑ کر کہتے تھے کہ آپ ہم جیسے شرفاء و معززین کے خلاف ہر کنگلے اور ہر فقیر کی دی ہوئی خبروں پر یقین کر لیتے ہیں۔

[2] جواب میں ایک جامع بات ارشاد ہوئی ہے جو اپنے اندر دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ فساد اور شر کی باتیں سننے والا آدمی نہیں ہے بلکہ صرف انہی باتوں پر توجہ کرتا ہے جن میں خیر اور بھلائی ہے اور جن کی طرف التفات کرنا امت کی بہتری اور دین کی مصلحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا ایسا ہونا تمہارے ہی لیے بھلائی ہے۔ اگر وہ ہر ایک کی سن لینے والا اور ضبط و تحمل سے کام لینے والا آدمی نہ ہوتا تو ایمان کے وہ جھوٹے دعوے اور خیر سگالی کی وہ نمائشی باتیں اور راہِ خدا سے بھاگنے کے لیے وہ عذراتِ لنگ جو تم کیا کرتے ہو انہیں صبر سے سننے کے بجائے تمہاری خبر لے ڈالتا اور تمہارے

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۱ پر)

ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لیے دردناک سزا ہے"۔

یہ لوگ تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمھیں راضی کریں۔ حالانکہ اگر یہ مومن ہیں تو اللہ اور رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں۔ کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتا ہے اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہ بہت بڑی رسوائی ہے؟

یہ منافق ڈر رہے ہیں کہ کہیں ان پر کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کے دلوں کے بھید کھول کر رکھ دے[۱۵]۔ اے نبی! ان سے کہو "اور مذاق اڑاؤ، اللہ اس چیز کو کھول دینے والا ہے جس کے کھل جانے سے تم ڈرتے ہو"۔ اگر ان سے پوچھو (کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے) تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے[۱۶]۔ ان سے کہو "کیا تمھاری ہنسی دل لگی اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ہی کے ساتھ تھی؟ اب عذرات نہ تراشو، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے، اگر ہم نے تم میں سے ایک گروہ کو معاف بھی کر دیا تو دوسرے گروہ کو ہم ضرور سزا دیں گے کیونکہ وہ مجرم ہے[۱۷]"۔

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں، برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روک رکھتے ہیں[۱۸]۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انھیں بھلا دیا۔ یقیناً یہ منافق ہی فاسق ہیں۔ ان منافق مردوں اور عورتوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) لیے مدینہ میں جینا دشوار ہو جاتا۔ پس اس کی یہ صفت تو تمھارے حق میں اچھی ہے نہ کہ بری۔ [۱۲] یعنی تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ وہ ہر ایک کی بات پر یقین لے آتا ہے۔ وہ چاہے سنتا سب کی ہو مگر اعتماد صرف انہی لوگوں پر کرتا ہے جو سچے مومن ہیں۔ تمھاری جن شرارتوں کی خبریں اس تک پہنچیں اور اس نے ان پر یقین کیا، وہ بد اخلاق چغل خوروں کی پہنچائی ہوئی نہ تھیں بلکہ صالح اہل ایمان کی پہنچائی ہوئی تھیں اور اس قابل تھیں کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۵] یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر سچا ایمان تو نہیں رکھتے تھے لیکن جو تجربات انھیں پچھلے آٹھ نو سالوں کے دوران میں ہو چکے تھے ان کی بنا پر انھیں اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ آپ کے پاس کوئی نہ کوئی فوق الفطری ذریعۂ معلومات ضرور ہے جس سے آپ کو ان کے پوشیدہ رازوں تک کی خبر پہنچ جاتی ہے اور بسا اوقات قرآن میں (جسے وہ حضور کی اپنی تصنیف سمجھتے تھے) آپ ان کے نفاق اور ان کی سازشوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیتے تھے۔

[۱۶] غزوۂ تبوک کی تیاری کے زمانہ میں بہت سے منافق اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے اور اپنی تضحیک سے لوگوں کی ہمتیں پست کرنے کی کوشش کرتے تھے جنھیں وہ نیک نیتی کے ساتھ جنگ کی تیاری میں مشغول پاتے۔ چنانچہ روایات میں ان لوگوں کے بہت سے اقوال منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک محفل میں چند منافق بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔ ایک نے کہا "اجی کیا رومیوں کو بھی تم نے کچھ عربوں کی طرح سمجھ رکھا ہے؟ کل دیکھ لینا کہ یہ سورما جو لڑنے تشریف لائے ہیں رسیوں میں بندھے ہوئے ہوں گے"۔ دوسرا بولا "مزا ہو جو اوپر سے سو سو کوڑے بھی لگانے کا حکم ہو جائے"۔ ایک اور منافق نے حضور کو جنگ کی سرگرم تیاریاں کرتے دیکھ کر اپنے یار دوستوں سے کہا "آپ کو دیکھیے، آپ روم و شام کے قلعے فتح کرنے چلے ہیں"۔

[۱۷] یعنی وہ کم عقل مسخرے تو معاف بھی کیے جا سکتے ہیں جو صرف اس لیے ایسی باتیں کرتے اور ان میں دلچسپی لیتے ہیں کہ ان کے نزدیک دنیا میں کوئی چیز سنجیدہ ہے ہی نہیں۔ لیکن جن لوگوں نے جان بوجھ کر یہ باتیں اس لیے کی ہیں کہ وہ رسول اور اس کے لائے ہوئے دین کو اپنے دعوائے ایمان کے باوجود ایک مضحکہ سمجھتے ہیں، اور جن کے اس تمسخر کا اصل مدعا یہ ہے کہ اہل ایمان کی ہمتیں پست ہوں اور وہ پوری توجہ کے ساتھ جہاد کی تیاری نہ کر سکیں، ان کو تو ہرگز معاف نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ مسخرے نہیں بلکہ مجرم ہیں۔

[۱۸] یہ تمام منافقین کی مشترک خصوصیت ہے۔ ان سب کو برائی سے دلچسپی اور بھلائی سے عداوت ہوتی ہے۔ کوئی شخص برا کام کرنا چاہے تو ان کی ہمدردیاں،

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۲ پر)

اور کافروں کے لیے اللہ نے آتشِ دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہی ان کے لیے موزوں ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔ ــــ تم لوگوں[۸۰] کے رنگ ڈھنگ وہی ہیں جو تمہارے پیش روؤں کے تھے۔ وہ تم سے زیادہ زور آور اور تم سے بڑھ کر مال اور اولاد والے تھے، پھر انھوں نے دنیا میں اپنے حصے کے مزے لوٹ لیے اور تم نے بھی اپنے حصے کے مزے اسی طرح لوٹے جیسے انھوں نے لوٹے تھے، اور ویسی ہی بحثوں میں تم بھی پڑے جیسی بحثوں میں وہ پڑے تھے، سو ان کا انجام یہ ہوا کہ دنیا اور آخرت میں ان کا سب کیا دھرا ضائع ہو گیا اور وہی اب خسارے میں ہیں ــــ کیا ان[۸۱] لوگوں کو اپنے پیش روؤں کی تاریخ نہیں پہنچی؟ نوح کی قوم، عاد، ثمود، ابراہیم کی قوم، مدین کے لوگ اور وہ بستیاں جنھیں الٹ دیا گیا[۸۲]۔ ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ پھر یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے[۸۳]۔

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں[۸۴]۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱) ان کے مشورے، ان کی ہمت افزائیاں، ان کی اعانتیں، ان کی سفارشیں، اور مدح سرائیاں، سب اس کے لیے وقف ہوں گی، دل و جان سے خود اس برے کام میں شریک ہوں گے، دوسروں کو اس میں حصہ لینے کی ترغیب دیں گے، کرنے والے کی ہمت بڑھائیں گے، اور ان کی ہر ادا سے یہ ظاہر ہو گا کہ اس برائی کے پروان چڑھنے سے کچھ ان کے دل کو راحت اور ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ بخلاف اس کے کوئی بھلا کام ہوتا ہو تو اس کی خبر سے ان کو صدمہ ہوتا ہے، اس کے تصور سے ان کا دل دکھتا ہے، اس کی تجویز تک انھیں گوارا نہیں ہوتی، اس کی طرف کسی کو بڑھتے دیکھتے ہیں تو ان کی روح بے چین ہونے لگتی ہے، ہر ممکن طریقہ سے اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں اور ہر تدبیر سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح وہ اس نیکی سے باز آ جائے اور باز نہیں آتا تو اس کام میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر یہ بھی ان سب کا مشترک خاصہ ہے کہ نیکی کے کام میں خرچ کرنے کے لیے ان کا ہاتھ کبھی نہیں کھلتا، خواہ وہ کنجوس ہوں یا بڑے خرچ کرنے والے ہوں، بہرحال ان کی دولت یا تجوریوں کے لیے ہوتی ہے یا پھر حرام راستوں سے آتی اور حرام ہی کے راستوں میں جاتی ہے۔ بدی کے لیے چاہے وہ اپنے وقت کے قارون ہوں، مگر نیکی کے لیے ان سے زیادہ مفلس کوئی نہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۸۰] منافقین کا غائبانہ ذکر کرتے کرتے یکایک ان سے براہ راست خطاب شروع ہو گیا ہے۔

[۸۱] یہاں سے پھر ان کا غائبانہ ذکر شروع ہو گیا۔

[۸۲] اشارہ ہے قوم لوط کی بستیوں کی طرف۔

[۸۳] یعنی ان کی تباہی و بربادی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اللہ کو ان کے ساتھ کوئی دشمنی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ انھیں تباہ کرے بلکہ دراصل انھوں نے خود ہی اپنے لیے وہ طرزِ زندگی پسند کیا جو انھیں بربادی کی طرف لے جانے والا تھا۔ اللہ نے تو انھیں سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کا پورا موقع دیا، ان کی فہمائش کے لیے رسول بھیجے، رسولوں کے ذریعے سے ان کو غلط روی کے برے نتائج سے آگاہ کیا اور انھیں کھول کھول کر نہایت واضح طریقے سے بتا دیا کہ ان کے لیے فلاح کا راستہ کون سا ہے اور ہلاکت و بربادی کا کون سا۔ مگر جب انھوں نے اصلاحِ حال کے کسی موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور ہلاکت کی راہ چلنے ہی پر اصرار کیا تو لامحالہ ان کا وہ انجام ہونا ہی تھا جو بالآخر ہو کر رہا، اور یہ ظلم اللہ نے ان پر نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر کیا۔

[۸۴] جس طرح منافقین ایک الگ امت ہیں اسی طرح اہلِ ایمان بھی ایک الگ امت ہیں اگرچہ ایمان کا ظاہری اقرار اور اسلام کی پیروی

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۳ پر)

یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔ ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی، اور سب سے بڑھکر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انھیں حاصل ہوگی، یہی بڑی کامیابی ہے۔

اے[91] نبی! کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ،[92] آخر کار ان کا ٹھکانا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) کا خارجی اظہار ان دونوں گروہوں میں مشترک ہے لیکن دونوں کے مزاج، اخلاق، اطوار، عادات اور طرز فکر و عمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جہاں ایمان کا دعویٰ ہے مگر دل سچے ایمان سے خالی ہیں وہاں زندگی کا سارا رنگ ڈھنگ ایسا ہے جو اپنی ایک ایک ادا سے اس دعوائے ایمان کی تکذیب کر رہا ہے۔ اوپر کے لیبل پر تو لکھا ہے کہ یہ مشک ہے مگر لیبل کے نیچے جو کچھ ہے وہ اپنے پورے وجود سے ثابت کر رہا ہے کہ یہ گوبر کے سوا کچھ نہیں۔ بخلاف اس کے جہاں ایمان اپنی اصل حقیقت کے ساتھ موجود ہے وہاں مشک اپنی صورت سے، اپنی خوشبو سے، اپنی خاصیتوں سے ہر آزمائش اور ہر معاملہ میں اپنا مشک ہونا کھولے دے رہا ہے۔ اسلام و ایمان کے عرفی نام نے بظاہر دونوں گروہوں کو ایک امت بنا رکھا ہے، مگر فی الواقع منافق مسلمانوں کا اخلاقی مزاج اور رنگ طبیعت کچھ اور ہے اور صادق الایمان مسلمانوں کا کچھ اور۔ اسی وجہ سے منافقانہ خصائل رکھنے والے مرد و زن ایک الگ جتھا بن گئے ہیں جن کو خدا سے غفلت، برائی سے دلچسپی، نیکی سے بعد اور خیر سے عدم تعاون کی مشترک خصوصیات نے ایک دوسرے سے وابستہ اور اہل ایمان سے عملاً بے تعلق کر دیا ہے، اور دوسری جانب سچے مومن مرد و زن ایک دوسرا گروہ بن گئے ہیں جس کے سارے افراد میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ نیکی سے وہ دلچسپی رکھتے ہیں، بدی سے نفرت کرتے ہیں، خدا کی یاد ان کے لیے غذا کی طرح زندگی کی ناگزیر ضروریات میں شامل ہے، راہ خدا میں خرچ کرنے کے لیے ان کے دل اور ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، اور خدا اور رسول کی اطاعت ان کی زندگی کا وتیرہ ہے، اس مشترک اخلاقی مزاج اور طرز زندگی نے انھیں آپس میں ایک دوسرے سے جوڑا اور منافقین کے گروہ سے توڑ دیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [91] یہاں سے ایک تیسری تقریر شروع ہوتی ہے جو غزوہ تبوک کے بعد نازل ہوئی ہے۔

[92] اس وقت تک منافقین کے ساتھ زیادہ تر درگزر کا معاملہ ہو رہا تھا اور اس کے دو وجوہ تھے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کی طاقت ابھی اتنی مضبوط نہ ہوئی تھی کہ باہر کے دشمنوں سے لڑنے کے ساتھ ساتھ وہ گھر کے دشمنوں سے بھی لڑائی مول لے لیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے جو لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا تھے ان کو ایمان و یقین حاصل کرنے کے لیے کافی موقع دینا مقصود تھا۔ یہ دونوں وجوہ اب باقی نہیں رہے تھے۔ مسلمانوں کی طاقت اب تمام عرب کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی اور عرب سے باہر کی طاقتوں سے کشمکش کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا اس لیے ان آستین کے سانپوں کا سر کچلنا اب ممکن بھی تھا اور ضروری بھی ہو گیا تھا، تاکہ یہ لوگ بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر کے ملک میں کوئی اندرونی خطرہ نہ کھڑا کر سکیں۔ پھر ان لوگوں کو پورے ۹ سال تک سوچنے، سمجھنے اور دین حق کو پرکھنے کا موقع بھی دیا جا چکا تھا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے اگر ان میں واقعی خیر کی کوئی طلب ہوتی۔ اس کے بعد ان کے ساتھ مزید رعایت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس لیے حکم ہوا کہ کفار کے ساتھ ساتھ اب ان منافقین کے خلاف بھی جہاد (Campaign) شروع کر دیا جائے اور جو نرم رویہ اب تک ان کے معاملہ میں اختیار کیا جاتا رہا ہے، اسے ختم کر کے اب ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے۔

منافقین کے خلاف جہاد اور سخت برتاؤ سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان سے جنگ کی جائے، بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کی منافقانہ روش سے جو چشم پوشی اب تک برتی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ مسلمانوں میں ملے جلے رہے اور عام مسلمان ان کو اپنی ہی سوسائٹی کا ایک جز سمجھتے رہے اور ان کو جماعت

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۴ پر)

جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔ یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی، حالانکہ انھوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے[۸۲]۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انھوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے[۸۳]۔ یہ ان کا سارا غصہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) کے معاملات میں دخل دینے اور سوسائٹی میں اپنے نفاق کا زہر پھیلانے کا موقع ملتا رہا، اس کو آئندہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اب جو شخص بھی مسلمانوں میں شامل رہ کر منافقانہ روش اختیار کرے اور جس کے طرزِ عمل سے بھی یہ ظاہر ہو کہ وہ خدا اور رسول اور اہلِ ایمان کا مخلص رفیق نہیں ہے، اسے کھلم کھلا بے نقاب کیا جائے، علانیہ اس کو ملامت کی جائے، سوسائٹی میں اس کے لیے عزت و اعتبار کا کوئی مقام باقی نہ رہنے دیا جائے، معاشرت میں اس سے قطع تعلق ہو، جماعتی مشوروں سے وہ الگ رکھا جائے، عدالتوں میں اس کی شہادت غیر معتبر ہو، عہدوں اور مناصب کا دروازہ اس کے لیے بند رہے، محفلوں میں اسے کوئی منہ نہ لگائے، ہر مسلمان اس سے ایسا برتاؤ کرے جس سے اس کو خود معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں کہیں بھی اس کا کوئی وقار نہیں اور کسی دل میں بھی اس کے لیے احترام کا کوئی گوشہ نہیں۔ پھر اگر ان میں سے کوئی شخص کسی صریح غداری کا مرتکب ہو تو اس کے جرم پر پردہ نہ ڈالا جائے، نہ اسے معاف کیا جائے، بلکہ علی رؤس الاشہاد اس پر مقدمہ چلایا جائے اور اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔

یہ ایک نہایت اہم ہدایت تھی جو اس مرحلہ پر مسلمانوں کو دی جانی ضروری تھی۔ اس کے بغیر اسلامی سوسائٹی کو تنزل و انحطاط کے اندرونی اسباب سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کوئی جماعت جو اپنے اندر منافقوں اور غداروں کو پرورش کرتی ہو اور جس میں گھر کے سانپ عزت اور تحفظ کے ساتھ آستینوں میں بٹھائے جاتے ہوں، اخلاقی زوال اور بالآخر کامل تباہی سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نفاق کا حال طاعون کا سا ہے اور منافق وہ چوہا ہے جو اس وبا کے جراثیم لیے پھرتا ہے۔ اس کو آبادی میں آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے کا موقع دینا گویا پوری آبادی کو موت کے خطرے میں ڈالنا ہے۔ ایک منافق کو مسلمانوں کی سوسائٹی میں عزت و احترام کا مرتبہ حاصل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہزاروں آدمی غداری و منافقت پر دلیر ہو جائیں اور یہ خیال عام ہو جائے کہ اس سوسائٹی میں عزت پانے کے لیے اخلاص، خیر خواہی اور صداقتِ ایمانی کچھ ضروری نہیں ہے بلکہ جھوٹے اظہارِ ایمان کے ساتھ خیانت اور بے وفائی کا رویہ اختیار کر کے بھی یہاں آدمی پھل پھول سکتا ہے۔ یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر سے حکیمانہ فقرے میں بیان فرمایا ہے کہ من وقر صاحب بدعۃ فقد اعان علی ہدم الاسلام "جس شخص نے کسی صاحبِ بدعت کی تعظیم و توقیر کی وہ دراصل اسلام کی عمارت ڈھانے میں مددگار ہوا"۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۸۲] وہ بات کیا تھی جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے، اس کے متعلق کوئی یقینی معلومات ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ البتہ روایات میں متعدد ایسی کافرانہ باتوں کا ذکر آیا ہے جو اس زمانہ میں منافقین نے کی تھیں۔ مثلاً ایک منافق کے متعلق مروی ہے کہ اس نے اپنے عزیزوں میں سے ایک مسلمان نوجوان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "اگر واقعی وہ سب کچھ برحق ہے جو یہ شخص (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم) پیش کرتا ہے تو ہم سب گدھوں سے بھی بدتر ہیں"۔ ایک اور روایت میں ہے کہ تبوک کے سفر میں ایک جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی گم ہو گئی۔ مسلمان اس کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اس پر منافقوں کے ایک گروہ نے اپنی مجلس میں بیٹھ کر خوب مذاق اڑایا اور آپس میں کہا کہ "یہ حضرت آسمان کی خبریں تو خوب سناتے ہیں، مگر ان کو اپنی اونٹنی کی کچھ خبر نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے"۔

[۸۳] یہ اشارہ ہے ان سازشوں کی طرف جو منافقوں نے غزوۂ تبوک کے سلسلے میں کی تھیں۔ ان میں سے پہلی سازش کا واقعہ محدثین نے اس طرح بیان کیا ہے کہ تبوک سے واپسی پر جب مسلمانوں کا لشکر ایک ایسے مقام کے قریب پہنچا جہاں سے پہاڑوں کے درمیان راستہ گزرتا تھا

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۵ پر)

اس بات پر ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے[۸۳]! اب اگر یہ اپنی اس روش سے باز آجائیں تو انہی کے لیے بہتر ہے ورنہ اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور یہ زمین میں اپنا کوئی حمایتی اور مددگار نہ پائیں گے۔

ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح بن کر رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولت مند کر دیا تو وہ بخل پر اتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انھیں اس کی پروا تک نہیں ہے[۸۴]۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بدعہدی کی وجہ سے جو انھوں نے اللہ کے ساتھ کی اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ کیا یہ لوگ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ کو ان کے مخفی راز اور ان کی پوشیدہ سرگوشیاں تک معلوم ہیں اور وہ تمام غیب کی باتوں سے پوری طرح باخبر ہے؟ (وہ خوب جانتا ہے ان کنجوس دولت مندوں کو) جو برضا و رغبت دینے والے اہلِ ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (راہِ خدا میں دینے کے لیے) اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دیتے ہیں[۸۵]۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ اے نبی! تم خواہ ایسے لوگوں کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴) تو بعض منافقین نے آپس میں طے کیا کہ رات کے وقت کسی گھاٹی میں سے گزرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڈ میں پھینک دیں گے۔ حضور کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ آپ نے تمام اہلِ لشکر کو حکم دیا کہ وادی کے راستے سے نکل جائیں، اور آپ خود صرف عمار بن یاسرؓ اور حذیفہ بن یمانؓ کو لے کر گھاٹی کے راستے سے چلے۔ اثنائے راہ میں یکایک معلوم ہوا کہ دس بارہ منافق ڈھاٹے باندھے ہوئے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت حذیفہؓ ان کی طرف لپکے تاکہ ان کے اونٹوں کو مار مار کر ان کے منہ پھیر دیں۔ مگر وہ دور ہی سے حضرت حذیفہؓ کو آتے دیکھ کر ڈر گئے اور اس خوف سے کہ کہیں ہم پہچان نہ لیے جائیں فوراً بھاگ نکلے۔

دوسری سازش جس کا اس سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے، یہ ہے کہ منافقین کو رومیوں کے مقابلہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے وفادار ساتھیوں کے بخیریت بچ کر واپس آجانے کی توقع نہ تھی، اس لیے انھوں نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ جونہی اُدھر کوئی سانحہ پیش آئے اِدھر مدینہ میں عبداللہ بن اُبی کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیا جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۸۳] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ عرب کے قصبات میں سے ایک معمولی قصبہ تھا اور اوس و خزرج کے قبیلے عرب کے قبائل میں مال یا جاہ کے لحاظ سے کوئی اونچا درجہ نہ رکھتے تھے۔ مگر جب حضور وہاں تشریف لے گئے اور انصار نے آپ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیا تو آٹھ نو سال کے اندر اندر یہی متوسط درجہ کا قصبہ تمام عرب کا دارالسلطنت بن گیا۔ وہی اوس و خزرج کے کاشتکار سلطنت کے اعیان و اکابر بن گئے اور ہر طرف سے فتوحات، غنائم اور تجارت کی برکات اس مرکزی شہر پر بارش کی طرح برسنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ اسی پر انھیں شرم دلا رہا ہے کہ ہمارے نبی پر تمہارا یہ غصہ کیا اسی قصور کی پاداش میں ہے کہ اس کی بدولت یہ نعمتیں تمہیں بخشی گئیں!

[۸۴] اوپر کی آیت میں ان منافقین کی جس کافر نعمتی و محسن کشی پر ملامت کی گئی تھی اس کا ایک اور ثبوت خود انہی کی زندگیوں سے پیش کر کے بیان واضح کیا گیا ہے کہ دراصل یہ لوگ عادی مجرم ہیں، ان کے ضابطۂ اخلاق میں شکر، اعترافِ نعمت، اور پاسِ عہد جیسی خوبیوں کا کہیں نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔

[۸۵] غزوۂ تبوک کے موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چندے کی اپیل کی تو بڑے بڑے مالدار منافقین ہاتھ روکے بیٹھے رہے۔ مگر جب مخلص اہلِ ایمان بڑھ بڑھ کر چندے دینے لگے تو ان لوگوں نے اُن پر باتیں چھانٹنی شروع کیں۔ کوئی ذی استطاعت مسلمان اپنی حیثیت کے مطابق یا اس سے بڑھ کر کوئی بڑی

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۶ پر)

معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی انھیں معاف کردینے کی درخواست کروگے تو اللہ انھیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے، اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نجات نہیں دکھاتا۔

جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انھیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ "اس سخت گرمی میں نہ نکلو۔" ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش انھیں اس کا شعور ہوتا۔ اب چاہیے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ، اس لیے کہ جو بدی یہ کماتے رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انھیں اس پر رونا چاہیے)۔ اگر اللہ ان کے درمیان تمھیں واپس لے جائے اور آئندہ ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لیے نکلنے کی تم سے اجازت مانگے تو صاف کہدینا کہ "اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے اور نہ میری معیت میں لڑ سکتے ہو، تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا تو اب گھر بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ بیٹھے رہو۔"

اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا کیونکہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے[1]۔ ان کی مالداری اور ان کی کثرت اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اللہ نے تو ارادہ کرلیا ہے کہ اس مال و اولاد کے ذریعہ سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔

جب کبھی کوئی سورۃ اس مضمون کی نازل ہوئی کہ اللہ کو مانو اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو تم نے دیکھا کہ جو لوگ ان میں سے صاحب مقدرت تھے وہی تم سے درخواست کرنے لگے کہ انھیں جہاد کی شرکت سے معاف رکھا جائے اور انھوں نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیجیے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں۔ ان لوگوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا گیا، اس لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵) رقم پیش کرتا تو یہ اس پر ریاکاری کا الزام لگاتے، اور اگر کوئی غریب مسلمان اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر کوئی چھوٹی سی رقم حاضر کرتا یا رات بھر محنت مزدوری کرکے کچھ کھجوریں حاصل کرتا اور وہی لا کر پیش کردیتا تو یہ اس پر آوازے کستے کہ لو یہ ٹڈی کی ٹانگ بھی آگئی ہے تاکہ اس سے روم کے قلعے فتح کیے جائیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] تبوک سے واپسی پر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین مرگیا۔ اس کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ جو مخلص مسلمانوں میں سے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کفن میں لگانے کے لیے آپ کا کرتا مانگا۔ آپ نے کمال فراخ دلی کے ساتھ وہ عطا کردیا۔ پھر انھوں نے درخواست کی کہ آپ ہی اس کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ آپ اس کے لیے بھی تیار ہوگئے۔ حضرت عمر نے باصرار عرض کیا کہ یا رسول اللہ، کیا آپ اس شخص پر نماز جنازہ پڑھیں گے جو یہ اور یہ کر چکا ہے۔ مگر حضور ان کی یہ سب باتیں سن کر مسکراتے رہے اور اپنی اُس رحمت کی بنا پر جو دوست دشمن سب کے لیے عام تھی، آپ نے اس بدترین دشمن کے حق میں بھی دعائے مغفرت کرنے میں تامل نہ کیا۔ آخر جب آپ نماز پڑھانے کھڑے ہی ہوگئے تو یہ آیت نازل ہوئی اور براہ راست حکم خداوندی سے آپ کو روک دیا گیا، کیونکہ اب یہ مستقل پالیسی مقرر کی جاچکی تھی کہ مسلمانوں کی جماعت میں منافقین کو کسی طرح پنپنے نہ دیا جائے اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے اس گروہ کی ہمت افزائی ہو۔

اسی سے یہ مسئلہ نکلا ہے کہ فساق اور فجار اور مشہور بد فسق لوگوں کی نماز جنازہ مسلمانوں کے امام اور سربرآوردہ لوگوں کو نہ پڑھانی چاہیے نہ پڑھنی چاہیے۔ ان آیات کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ ہوگیا تھا کہ جب آپ کو کسی جنازے پر تشریف لانے کے لیے کہا جاتا تو آپ پہلے مرنے والے کے متعلق دریافت کرتے تھے کہ کس قسم کا آدمی تھا، اور اگر معلوم ہوتا کہ برے چلن کا آدمی تھا تو آپ اس کے گھر والوں سے کہہ دیتے کہ تمھیں اختیار ہے جس طرح چاہو اسے دفن کردو۔

ان کی سمجھ میں اب کچھ نہیں آتا۔[۱] بخلاف اس کے رسول نے اور ان لوگوں نے جو رسول کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور اب ساری بھلائیاں انہی کے لیے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے عظیم الشان کامیابی۔ ع ۱۱

بدوی عربوں میں سے بھی بہت سے لوگ آئے[۲] جنھوں نے عذر کیے تاکہ انھیں بھی پیچھے رہ جانے کی اجازت دی جائے۔ اس طرح بیٹھ رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے ایمان کا جھوٹا عہد کیا تھا۔ ان بدویوں میں سے جن جن لوگوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا ہے[۳] عنقریب وہ دردناک سزا سے دوچار ہوں گے۔

ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکت جہاد کے لیے زادِ راہ نہیں پاتے، اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں۔[۴] ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اللہ

---

۱ یعنی اگرچہ یہ بڑی شرم کے قابل بات ہو کر اچھے خاصے ہٹے کٹے، تندرست، صاحب مقدرت لوگ، ایمان کا دعوی رکھنے کے باوجود کام کا وقت آنے پر میدان میں نکلنے کے بجائے گھروں میں گھس بیٹھیں اور عورتوں میں جا شامل ہوں، لیکن چونکہ ان لوگوں نے خود جان بوجھ کر اپنے لیے یہی رویہ پسند کیا تھا اس لیے قانون فطرت کے مطابق ان سے وہ پاکیزہ احساسات چھین لیے گئے جن کی بدولت آدمی ایسے ذلیل اطوار اختیار کرنے میں شرم محسوس کیا کرتا ہے۔

۲ بدوی عربوں سے مراد مدینہ کے اطراف میں رہنے والے دیہاتی اور صحرائی عرب ہیں جنھیں عام طور پر بدو کہا جاتا ہے۔

۳ منافقانہ اظہار ایمان جس کی تہ میں فی الواقع تصدیق، تسلیم، اخلاص اور اطاعت نہ ہو۔ اور جس کے ظاہری اقرار کے باوجود انسان خدا اور اس کے دین کی بہ نسبت اپنے مفاد اور اپنی دنیوی دلچسپیوں کو عزیز تر رکھتا ہو، اصل حقیقت کے اعتبار سے کفر و انکار ہی ہے اور خدا کے ہاں ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو منکروں اور باغیوں کے ساتھ ہوگا، چاہے دنیا میں اس قسم کے لوگ کافر نہ ٹھیرائے جا سکتے ہوں اور ان کے ساتھ مسلمانوں ہی کا سا معاملہ ہوتا رہے۔ اس دنیوی زندگی میں جس قانون پر مسلم سوسائٹی کا نظام قائم کیا گیا ہے اور جس ضابطہ کی بنا پر اسلامی حکومت اور اس کے قاضی احکام کی تنفیذ کرتے ہیں، اس کے لحاظ سے تو منافقت پر کفر یا اشتباہ کفر کا حکم صرف انہی صورتوں میں لگایا جا سکتا ہے جبکہ انکار و بغاوت یا غداری و بے وفائی کا اظہار صریح طور پر ہو جائے، اس لیے منافقت کی بہت سی صورتیں اور حالتیں ایسی رہ جاتی ہیں جو قضائے شرعی میں کفر کے حکم سے بچ جاتی ہیں۔ لیکن قضائے شرعی میں کسی منافق کا حکم کفر سے بچ نکلنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ قضائے خداوندی میں بھی وہ اس حکم اور اس کی سزا سے بچ نکلے گا۔

۴ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ بظاہر معذور ہوں ان کے لیے بھی مجرد ضعیفی و بیماری یا محض ناداری کافی وجہ معافی نہیں ہے بلکہ ان کی یہ مجبوریاں صرف اس صورت میں ان کے لیے وجہ معافی ہو سکتی ہیں جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے سچے وفادار ہوں، ورنہ اگر وفاداری موجود نہ ہو تو کوئی شخص صرف اس لیے معاف نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ادائے فرض کے موقع پر بیمار یا نادار تھا۔ خدا صرف ظاہر کو نہیں دیکھتا ہے کہ ایسے سب لوگ جو بیماری کا طبی صداقت نامہ یا بڑھاپے اور جسمانی نقص کا عذر پیش کریں، اس کے ہاں یکساں معذور قرار دے دیے جائیں اور ان پر سے باز پرس ساقط ہو جائے۔ وہ تو ان میں سے ایک ایک شخص کے دل کا جائزہ لے گا، اس کے پورے مخفی و ظاہر برتاؤ کو دیکھے گا، اور یہ جانچے گا کہ اس کی معذوری ایک وفادار بندے کی سی معذوری ہے یا ایک غدار اور باغی کی سی۔ ایک شخص ہے کہ جب اس نے فرض کی پکار سنی تو دل میں لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ "بڑے

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۸ پر)

درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہے جنھوں نے خود آکر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں، اور جب تم نے کہا کہ میں تمھارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کرسکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انھیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے۔[۹۵] البتہ اعتراض ان لوگوں پر ہے جو مالدار ہیں اور پھر بھی تم سے درخواستیں کرتے ہیں کہ انھیں شرکت جہاد سے معاف رکھا جائے۔ انھوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا، اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے۔

تم جب پلٹ کر ان کے پاس پہنچو گے تو یہ طرح طرح کے عذرات پیش کریں گے مگر تم صاف کہہ دینا کہ "بہانے نہ کرو، ہم تمھاری کسی بات کا اعتبار نہ کریں گے، اللہ نے ہم کو تمھارے حالات بتا دیے ہیں، اب اللہ اور اس کا رسول تمھارے طرز عمل کو دیکھے گا، پھر تم اُس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے اور وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔" تمھاری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۲) اچھے موقع پر میں بیمار ہو گیا ورنہ یہ بلا کسی طرح ٹالے نہ ٹلتی اور خواہ مخواہ کی مصیبت بھگتنی پڑتی۔" دوسرے شخص نے یہی بیماری تو ملا اٹھا کر "ہائے، کیسے موقع پر اس کمبخت بیماری نے آن دبوچا، جو وقت میدان میں نکل کر خدمت انجام دینے کا تھا وہ کس بری طرح یہاں بستر پر ضائع ہو رہا ہے۔" ایک نے اپنے لیے تو خدمت سے بچنے کا بہانہ پایا ہی تھا مگر اس کے ساتھ اس نے دوسروں کو بھی اس سے روکنے کی کوشش کی۔ دوسرا اگرچہ خود بستر علالت پر مجبور پڑا ہوا تھا مگر وہ برابر اپنے عزیزوں، دوستوں اور بھائیوں کو جہاد کا جوش دلاتا رہا اور اپنے تیمارداروں سے بھی کہتا رہا کہ "میرا اللہ مالک ہے، دوا دارو کا انتظام کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائے گا، مجھ اکیلے انسان کے لیے تم اس قیمتی وقت کو ضائع نہ کرو جسے دین حق کی خدمت میں صرف ہونا چاہیے۔" ایک نے بیماری کے عذر سے گھر بیٹھ کر سارا زمانۂ جنگ بددلی پھیلانے، بری خبریں اڑانے، جنگی مساعی کو خراب کرنے اور مجاہدین کے پیچھے ان کے گھر بگاڑنے میں صرف کیا۔ دوسرے نے یہ دیکھ کر کہ میدان میں جانے کے شرف سے وہ محروم رہ گیا ہے، اپنی حد تک پوری کوشش کی کہ گھر کے محاذ (Home front) کو مضبوط رکھنے میں جو زیادہ سے زیادہ خدمت اس سے بن آئے اسے انجام دے۔ ظاہر کے اعتبار سے تو یہ دونوں ہی معذور ہیں، مگر خدا کی نگاہ میں یہ دو مختلف قسم کے معذور کسی طرح یکساں نہیں ہو سکتے۔ خدا کے ہاں معافی اگر ہے تو صرف دوسرے شخص کے لیے، رہا پہلا شخص تو وہ اپنی معذوری کے باوجود غداری و نا وفاداری کا مجرم ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۹۵ ایسے لوگ جو خدمت دین کے لیے بے تاب ہوں اور اگر کسی حقیقی مجبوری کے سبب سے یا ذرائع نہ پانے کی وجہ سے عملاً خدمت نہ کر سکیں تو ان کے دل کو اتنا ہی سخت صدمہ ہو جتنا کسی دنیا پرست کو روزگار چھوٹ جانے یا کسی بڑے نفع کے موقع سے محروم رہ جانے کا ہوا کرتا ہے، ان کا شمار خدا کے ہاں خدمت انجام دینے والوں ہی میں ہوگا اگرچہ انھوں نے عملاً کوئی خدمت انجام نہ دی ہو، اس لیے کہ وہ چاہے ہاتھ پاؤں سے کام نہ کر سکے ہوں لیکن دل سے تو وہ برسر خدمت (On active service) ہی رہے ہیں۔ یہی بات ہے جو غزوہ تبوک سے واپسی پر اثنائے سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقا کو خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی ان بالمدینۃ اقواما ما سرتم مسیرا ولا قطعتم وادیا الا کانوا معکم "مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے کوئی وادی طے نہیں کی اور کوئی کوچ نہیں کیا جس میں وہ تمھارے ساتھ ساتھ نہ رہے ہوں۔" صحابہ نے تعجب سے کہا "کیا مدینہ ہی میں رہتے ہوئے؟" فرمایا "ہاں، مدینے ہی میں رہتے ہوئے، کیونکہ مجبوری نے انھیں روک لیا تھا ورنہ وہ خود رکنے والے نہ تھے۔"

واپسی پر یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے صَرفِ نظر کرو، تو بے شک تم ان سے صرفِ نظر ہی کر لو[۹۵]، کیونکہ یہ ایک گندگی ہیں اور ان کا اصلی مقام جہنم ہے جو ان کی کمائی کے بدلے میں انھیں نصیب ہوگی۔ یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ہرگز ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہ ہوگا۔

یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اُس دین کے حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے[۹۶]۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔ ان میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں

[۹۵] پہلے فقرے میں صرفِ نظر سے مراد درگزر ہے اور دوسرے فقرے میں قطع تعلق۔ یعنی وہ تو چاہتے ہیں کہ تم ان سے تعرض نہ کرو، مگر بہتر یہ ہے کہ تم ان سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھو اور سمجھ لو کہ تم ان سے کٹ گئے اور وہ تم سے۔

[۹۶] جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہاں بدوی عربوں سے مراد وہ دیہاتی و صحرائی عرب ہیں جو مدینہ کے اطراف میں آباد تھے۔ یہ لوگ مدینہ میں ایک مضبوط اور منظم طاقت کو اٹھتے دیکھ کر پہلے تو مرعوب ہوئے، پھر اسلام اور کفر کی آویزشوں کے دوران میں ایک مدت تک موقع شناسی و ابن الوقتی کی روش پر چلتے رہے۔ پھر جب اسلامی حکومت کا اقتدار حجاز و نجد کے ایک بڑے حصے پر چھا گیا اور مخالف قبیلوں کا زور اس کے مقابلہ میں ٹوٹنے لگا تو ان لوگوں نے مصلحتِ وقت اسی میں دیکھی کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ لیکن ان میں کم لوگ ایسے تھے جو اس دین کو دینِ حق سمجھ کر سچے دل سے ایمان لائے ہوں اور مخلصانہ طریقہ سے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے پر آمادہ ہوں۔ بیشتر بدویوں کے لیے قبولِ اسلام کی حیثیت ایمان و اعتقاد کی نہیں بلکہ محض مصلحت اور پالیسی کی تھی۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کے حصہ میں صرف وہ فوائد آجائیں جو برسرِ اقتدار جماعت کی رکنیت اختیار کرنے سے حاصل ہوا کرتے ہیں۔ مگر وہ اخلاقی بندشیں جو اسلام ان پر عائد کرتا تھا، وہ نماز روزے کی پابندیاں جو اس دین کو قبول کرتے ہی ان پر لگ جاتی تھیں، وہ زکوٰۃ جو باقاعدہ تحصیل داروں کے ذریعہ سے ان کے نخلستانوں اور ان کے گلوں سے وصول کی جاتی تھی، وہ ضبط و نظم جس کے شکنجے میں وہ اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسے گئے تھے، وہ جان و مال کی قربانیاں جو لوٹ مار کی لڑائیوں میں نہیں بلکہ خالص راہِ خدا کے جہاد میں آئے دن ان سے طلب کی جا رہی تھیں، یہ ساری چیزیں ان کو شدت کے ساتھ ناگوار تھیں اور وہ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہر طرح کی چالبازیاں اور بہانہ سازیاں کرتے رہتے تھے۔ ان کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ حق کیا ہے اور ان کی اور تمام انسانوں کی حقیقی فلاح کس چیز میں ہے۔ انھیں جو کچھ بھی دلچسپی تھی وہ اپنے معاشی مفاد، اپنی آسائش، اپنی زمینوں، اپنے اونٹوں اور بکریوں اور اپنے خیمے کے آس پاس کی محدود دنیا سے تھی۔ اس سے بالاتر کسی چیز کے ساتھ وہ اُس طرح کی عقیدت تو رکھ سکتے تھے جیسی پیروں اور فقیروں سے رکھی جاتی ہے کہ ان کے آگے نذر و نیاز پیش کریں اور وہ اس کے عوض ترقی روزگار اور آفات سے تحفظ اور ایسی ہی دوسری اغراض کے لیے ان کو تعویذ گنڈے دیں اور ان کے لیے دعائیں کریں، لیکن ایسے ایمان و اعتقاد کے لیے وہ تیار نہ تھے جو ان کی پوری تمدنی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو اخلاق اور قانون کے ضابطہ میں کس دے اور مزید برآں ایک عالمگیر اصلاحی مشن کے لیے ان سے جان و مال کی قربانیوں کا بھی مطالبہ کرے۔

ان کی اسی حالت کو یہاں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ شہریوں کی بہ نسبت یہ دیہاتی و صحرائی لوگ زیادہ منافقانہ رویہ رکھتے ہیں اور حق سے انکار کی کیفیت ان کے اندر زیادہ پائی جاتی ہے۔ پھر اس کی وجہ بھی بتا دی ہے کہ شہری لوگ تو اہلِ علم اور اہلِ حق کی صحبت سے مستفید ہو کر کچھ دین کو اور اس کی حدود کو جان بھی لیتے ہیں، مگر یہ بدوی چونکہ ساری ساری عمر بالکل ایک معاشی حیوان کی طرح شب و روز رزق کے پھیر ہی میں پڑے رہتے ہیں اور حیوانی زندگی کی ضروریات سے بلند تر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا انھیں موقع ہی نہیں ملتا اس لیے دین اور اس کے

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۰ پر)

جو راہ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں[1] اور تمہارے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں (کہ تم کسی چکر میں پھنسو تو وہ اپنی گردن سے اس نظام کی اطاعت کا قلادہ اتار پھینکیں جس میں تم نے انھیں کس دیا ہے) حالانکہ بدی کا چکر خود انہی پر مسلط ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسول کی طرف سے رحمت کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں! وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا، یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع۱۲

وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راستبازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

تمہارے گرد و پیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں، تم انھیں نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں[2]، قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دوہری سزا دیں گے[3] پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لیے واپس لائے جائیں گے

کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے، ان کا عمل مخلوط ہے، کچھ نیک اور کچھ بد۔ بعید نہیں کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اے نبی! تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انھیں بڑھاؤ، اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو کیونکہ تمہاری دعا ان کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹) حدود سے ان کے ناواقف رہنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

یہاں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا غیر موزوں نہ ہوگا کہ ان آیات کے نزول سے تقریباً دو سال بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے ابتدائی عہد میں ارتداد اور منعِ زکوٰۃ کا جو طوفان برپا ہوا تھا اس کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہی تھا جس کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] مطلب یہ ہے کہ جو زکوٰۃ ان سے وصول کی جاتی ہے اسے یہ ایک جرمانہ سمجھتے ہیں۔ مسافروں کی ضیافت و مہمانداری کا جو حق ان پر عائد کیا گیا ہے وہ ان کو بری طرح کھلتا ہے۔ اور اگر کسی جنگ کے موقع پر یہ کوئی چندہ دیتے ہیں تو اپنے دلی جذبہ سے رضائے الٰہی کی خاطر نہیں دیتے بلکہ بادلِ ناخواستہ اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے دیتے ہیں۔

[2] یعنی اپنے نفاق کو چھپانے میں اتنے مشاق ہو گئے ہیں کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی کمال درجے کی فراست کے باوجود ان کو نہیں پہچان سکتے۔

[3] دوہری سزا سے مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ دنیا جس کی محبت میں مبتلا ہو کر انھوں نے ایمان و اخلاص کے بجائے منافقت اور غداری کا رویہ اختیار کیا ہے ان کے ہاتھ سے جائے گی اور یہ مال و جاہ اور عزت حاصل کرنے کے بجائے الٹی ذلت و نامرادی پائیں گے۔ دوسری طرف جس مشن کو یہ ناکام دیکھنا اور اپنی چال بازیوں سے ناکام کرنا چاہتے ہیں وہ ان کی خواہشوں اور کوششوں کے علی الرغم ان کی آنکھوں کے سامنے فروغ پائے گا۔

وجہ تسکین ہوگی، اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے، اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے؟ اور اے نبی ان لوگوں سے کہدو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کا رسول اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرزِ عمل اب کیا رہتا ہے۔[لہ] پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤگے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے اور وہ تمہیں بتادے گا کہ تم

لہ یہاں جھوٹے مدعیٔ ایمان اور گناہ گار مومن کا فرق صاف صاف واضح کردیا گیا ہے۔ جو شخص ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر فی الواقع خدا اور اس کے دین اور جماعت مومنین کے ساتھ کوئی خلوص نہیں رکھتا اس کے عدم اخلاص کا ثبوت اگر اس کے طرزِ عمل سے مل جائے تو اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے گا، خدا کی راہ میں صرف کرنے کے لیے وہ کوئی مال پیش کرے تو اسے رد کردیا جائے گا، مرجائے تو نہ مسلمان اس کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے اور نہ کوئی مومن اس کے لیے دعائے مغفرت کرے گا چاہے وہ اس کا باپ یا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ بخلاف اس کے جو شخص مومن ہو اور اس سے کوئی غیر مخلصانہ طرزِ عمل سرزد ہوجائے تو وہ اپنے قصور کا اعتراف کرلے تو اس کو معاف بھی کیا جائے گا، اس کے صدقات بھی قبول کیے جائیں گے اور اس کے لیے دعائے رحمت بھی کی جائے گی۔ اب رہی یہ بات کہ کس شخص کو غیر مخلصانہ طرزِ عمل کے صدور کے باوجود منافق کے بجائے محض گناہ گار مومن سمجھا جائے گا، تو یہ تین معیاروں سے پرکھی جائے گی جن کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱) وہ اپنے قصور کے لیے عذرات لنگ اور تاویلات و توجیہات پیش نہیں کرے گا بلکہ جو قصور ہوا ہے اسے سیدھی طرح صاف صاف مان لے گا۔

(۲) اس کے سابق طرزِ عمل پر نگاہ ڈال کر دیکھا جائے گا کہ یہ عدم اخلاص کا عادی مجرم تو نہیں ہے۔ اگر پہلے وہ جماعت کا ایک صالح فرد رہا ہے اور اس کے کارنامۂ زندگی میں مخلصانہ خدمات، ایثار و قربانی، اور سبقت الی الخیرات کا ریکارڈ موجود ہے تو باور کرلیا جائے گا کہ اس وقت جو قصور اس سے سرزد ہوا ہے وہ ایمان و اخلاص کے عدم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض ایک کمزوری ہے جو وقتی طور پر رونما ہوگئی ہے۔

(۳) اس کے آئندہ طرزِ عمل پر نگاہ رکھی جائے گی کہ آیا اس کا اعتراف قصور محض زبانی ہے یا فی الواقع اس کے اندر کوئی گہرا احساس ندامت موجود ہے۔ اگر وہ اپنے قصور کی تلافی کے لیے بے تاب نظر آئے اور اس کی بات بات سے ظاہر ہو کہ جس نقص ایمانی کا نقش اس کی زندگی میں ابھر آیا ہے اسے مٹانے اور اس کا تدارک کرنے کی وہ سخت کوشش کر رہا ہے، تو سمجھا جائے گا کہ وہ حقیقت میں نادم ہے اور یہ ندامت ہی اس کے ایمان و اخلاص کی دلیل ہوگی۔

محدثین نے ان آیات کی شان نزول میں جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے یہ مضمون آئینہ کی طرح روشن ہوجاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ آیات ابولبابہ اور ان جیسے سات آٹھ دوسرے اصحاب کے معاملہ میں نازل ہوئی تھیں۔ ابولبابہ ان لوگوں میں سے تھے جو بیعت عقبہ کے موقع پر ہجرت سے پہلے اسلام لائے تھے پھر یہ جنگ بدر، جنگ احد اور دوسرے معرکوں میں برابر شریک رہے، مگر غزوہ تبوک کے موقع پر نفس کی کمزوری نے غلبہ کیا اور یہ کسی عذر شرعی کے بغیر بیٹھے رہ گئے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے اور ان کو معلوم ہوا کہ پیچھے رہ جانے والوں کے متعلق اللہ اور رسول کی کیا رائے ہے تو انہیں سخت ندامت ہوئی۔ انھوں نے اپنے آپ کو خود ایک ستون سے باندھ لیا اور کہا کہ مجھ پر خواب و خور حرام ہے جب تک میں معاف نہ کردیا جاؤں یا پھر مرجاؤں۔ چنانچہ کئی روز وہ اسی طرح بے آب و دانہ اور بے خواب بندھے رہے حتیٰ کہ بیہوش ہوکر گر پڑے۔ آخر کار جب انھیں بتایا گیا کہ اللہ اور رسول نے تمہیں معاف

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۲ پر)

کیا کرتے رہے ہو۔[۱۰۱]

کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے حکم پر ٹھیرا ہوا ہے، چاہے انھیں سزا دے اور چاہے ان پر از سرِ نو مہربان ہو جائے اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔[۱۰۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۰) کر دیا تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ جس گھر کی آسائش نے مجھے فرض سے غافل کیا اسے اور اپنے تمام مال کو خدا کی راہ میں دیدوں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سارا مال دینے کی ضرورت نہیں، صرف ایک تہائی کافی ہے، اور وہ انھوں نے اسی وقت فی سبیل اللہ وقف کر دیا۔ تقریباً یہی معاملہ ان دوسرے اصحاب کے ساتھ بھی پیش آیا جو اس قصور میں ابولبابہ کے ساتھ شریک تھے۔ یہ سب حضرات عادی غیر مخلص نہ تھے بلکہ ان کا پچھلا کارنامۂ زندگی ان کے اخلاص ایمانی پر دلیل تھا۔ ان میں سے کسی نے عذرات نہیں تراشے بلکہ قصور کو سیدھی طرح قصور مان لیا۔ انھوں نے اعتراف قصور کے ساتھ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی نہایت نادم اور اپنے اس گناہ کی تلافی کے لیے سخت بے چین ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور مفید نکتہ پر بھی نگاہ رہنی چاہیے جو ان آیات میں ارشاد ہوا ہے۔ وہ یہ کہ گناہوں کی تلافی کے لیے زبان اور قلب کی توبہ کے ساتھ ساتھ عملی توبہ بھی ہونی چاہیے، اور اس عملی توبہ کی ایک شکل یہ ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں مال خیرات کرے۔ اس طرح وہ گندگی جو نفس میں پرورش پا رہی تھی اور جس کی بدولت آدمی سے گناہ کا صدور ہوا تھا، دور ہو جاتی ہے اور خیر کی طرف پلٹنے کی استعداد بڑھتی ہے۔ گناہ کرنے کے بعد اس کا اعتراف کرنا ایسا ہے جیسے ایک آدمی جو گڑھے میں گر گیا تھا، اپنے گرنے کو خود محسوس کرے۔ پھر اس کا اپنے گناہ پر شرمسار ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس گڑھے کو اپنے لیے نہایت بری جائے قرار سمجھتا ہے اور اپنی اس حالت سے سخت تکلیف میں ہے۔ پھر اس کا صدقہ و خیرات اور دوسری نیکیوں سے اس کی تلافی کی سعی کرنا گویا گڑھے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا ہے۔

(حواشی صفحہ ۱۳۱) [۱۰۱] مطلب یہ ہے کہ آخر کار معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جس سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی اس لیے بالفرض اگر کوئی شخص دنیا میں اپنے نفاق کو چھپانے میں کامیاب ہو جائے اور انسان جن جن معیاروں پر کسی کے ایمان و اخلاص کو پرکھ سکتے ہیں ان سب پر بھی پورا اتر جائے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ نفاق کی سزا پانے سے بچ نکلا ہے۔

[۱۰۲] یہ لوگ ایسے تھے جن کا معاملہ مشکوک تھا۔ نہ ان کے منافق ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا نہ گناہ گار مومن ہونے کا۔ ان دونوں چیزوں کی علامات ابھی پوری طرح نہ ابھری تھیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے معاملہ کو ملتوی رکھا، نہ اس معنی میں کہ فی الواقع خدا کے سامنے معاملہ مشکوک ہے بلکہ اس معنی میں کہ مسلمانوں کو کسی شخص یا گروہ کے معاملہ میں اپنا طرزِ عمل اس وقت تک متعین نہ کرنا چاہیے جب تک اس کی پوزیشن ایسی علامات سے واضح نہ ہو جائے جو علم غیب سے نہیں بلکہ حس اور عقل سے جانچی جا سکتی ہوں۔

مقالات

امامت حکمیہ کی حقیقت اور اس کی اقسام

(ماخوذ از "منصب امامت" مؤلفہ شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ)

مترجمہ نعیم صدیقی صاحب

(۳)

غرور و کبر بعض لوگ ایسے پائے جاتے ہیں کہ عین ان کی سرشت میں سرکشی اور خود پسندی کا خمیر شامل ہوتا ہے۔ ان کو اپنے منہ میاں مٹھو بننے اور ڈینگیں مارنے اور شیخی بگھارنے میں مزہ آتا ہے۔ اپنی ہستی کو ہمیشہ کچھ غلافوں میں لپیٹ کر رکھتے ہیں، کیونکہ اولاد آدم انھیں میل جول کے قابل نظر نہیں آتی۔ دوسروں کے بڑے سے بڑے کمال کو اپنی کسی ادنیٰ سی خوبی کے مقابلہ میں ہیچ ثابت کر دیں گے، چاہے اپنی خوبی محض ایک سراب تخیل ہو، جیسے حسب و نسب کا غرہ! دوسروں کے ساتھ کسی معاملہ میں برابر ہونا تو ان کے لیے بڑی شرم کی بات ہوتی ہے، اس وجہ سے اپنے ساتھیوں کی تحقیر کو اپنی آبرو شمار کرتے ہیں اور اپنے بھائیوں کے زوال کو اپنی عظمت کا ثبوت قرار دیتے ہیں، نیز دوسروں کے کمالات کو پایۂ اعتبار سے گرا گرا کر اپنی خصوصیات پر اتراتے ہیں۔ بس ان کا منتہائے مقصود فقط یہ ہوتا ہے کہ انھیں افراد انسانی کے درمیان اتنا امتیاز حاصل ہو جائے کہ کوئی ان کی برابری کی جرأت نہ کر سکے۔

اس قسم کا آدمی جب تخت حکومت پر قابض ہو گا تو کبر و نخوت کی داد دینے کے لیے آداب القاب، چال ڈھال، میل جول، اور دوسرے تمام معاملات میں اپنی ایک امتیازی شان پیدا کرے گا۔ پھر وہ اپنی ذات کے لیے مختلف چیزیں مخصوص کرے گا۔ ان میں کسی دوسرے کی شرکت و مساوات سے بہت رنجیدہ ہو گا بلکہ اس کی قطعی ممانعت کر دے گا۔ وہ جس تخت کو استعمال کرے گا اس پر بیٹھنا دوسروں کے لیے حرام کر دے گا، جس مجلس میں رونق افروز ہو گا اس میں دوسروں کا داخلہ روک دیگا، پھر جو خاص الفاظ اپنے لیے تجویز کر دے گا، مثلاً "سلطان"، "شاہ"، "بادشاہ"، "ملک" اور "حضور اقدس" وغیرہ، ان الفاظ کو اگر خود سلطان کے بیٹے پر بھی کسی نے استعمال کر دیا تو وہ مجرم قرار پائے گا اور شدید تعزیر اس پر عائد ہو گی۔ الغرض ایسے لوگوں کی دلی تمنا یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح خدا کے بندوں اور نبی کے امتیوں سے بالکل جدا اور ممتاز سمجھے جائیں کیونکہ انھیں وہ اپنا ہم جنس تسلیم نہیں کرتے اور ہر معاملہ میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد دوسروں سے الگ ہی بناتے ہیں۔

پھر ان ظالموں کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے قوانین جمہور میں اصول دین اور ضوابط شریعت کا درجہ حاصل کر لیں اور ہر خاص و عام ان کی پوری اطاعت کرے، نیز ان کے سامنے قیل و قال اور بحث و تمحیص کی کسی کو جرأت نہ ہو۔ گویا خود یہ لوگ احکام الٰہی کے مخاطب ہی نہیں، اور نہ ان احکام کی مخالفت پر انھیں کوئی پوچھنے والا ہے۔ یہ بڑا بننے اور حکم چلانے کی خواہش جلد جلد ترقی کر کے تعلّی کی صورت اختیار کرتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ نبوت یا الوہیت کا صفات دعویٰ کر دیا جاتا ہے۔ اب سلطانِ متکبر فراعنہ اور نماردہ کا بھائی بن جاتا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر کی کوئی صفت ایسی نہیں رہ جاتی جسے یہ ظالم اپنے پروانوں اور حکم ناموں میں اپنی ذات سے منسوب نہ کرے، اور خالق اکبر کے ناموں میں سے کوئی نام ایسا نہیں چھوٹ جاتا جسے یہ جاہل اپنے لقب کے طور پر استعمال نہ کرتا ہو۔ پھر انبیاء و مرسلین کے مدارج میں سے کوئی درجہ ایسا نہیں بچ رہتا کہ یہ دشمن دین اس کا مدعی نہ بنے۔ پھر خلفائے راشدین کے مراتب میں سے کوئی رتبہ ایسا نہیں باقی رہتا جس میں یہ شرارت استاد ان کی برابری کا دم نہ بھرتا ہو۔

غرور و کبر کی یہ سلطنت جس طرح پوری امت کے لیے اور پورے دین کے لیے حد درجہ مضر ہے، اسی طرح، بلکہ اس سے ہزار گنا زیادہ خود اس جاہل شیخی باز کے لیے سم قاتل ہے۔ کوئی سلطان اپنی سلطنت سے وہ نقصان نہیں اٹھاتا جو سلطانِ متکبر اپنی سلطنت سے اٹھاتا ہے۔ یہ ظالم اپنی ہستی کو رعایا کا گویا خالق سمجھتا ہے، خصوصاً جب زمانہ اس کا ساتھ دے رہا ہو اور قسمت یاوری کر رہی ہو، یعنی دنیا اس کے پنجہ میں بے بس ہو اور کسی کو سرکشی کی جرأت نہ ہو تو اس کا انداز استکبار خوب نمایاں ہو جاتا ہے اور اس کا طرۂ نخوت عرش کو جا چھوتا ہے۔ فرمایا صاحب نبوت نے

اذا مشت امتی المطیطاء وخدمتها ابناء الملوك ابناء فارس والروم سلط الله شرارها علی خیارها

جب میری امت اکڑ کر چلنے لگے گی اور فارس و روم کے شاہزادے اس کی خدمت بجالانے لگیں گے اس وقت اللہ تعالیٰ امت کے شریر لوگوں کو اس کے نیکوکار بندوں پر مسلط کر دے گا۔

نیز فرمایا:۔

الکبریاء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی واحداً منهما ادخلته النار

کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار، سو جس کسی نے ان دونوں میں سے کسی چیز کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی اسکو میں جہنم میں جھونکونگا

اور یہ بھی کہ:۔

اغیظ رجل علی الله یوم القیمة واخبث رجل کان یسمی ملك الاملاك لا ملك الا الله

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کو سب سے زیادہ بھڑکانے والا اور بدترین انسان وہ ہوگا جو دنیا میں بادشاہوں کا بادشاہ (شہنشاہ) کہا جاتا تھا۔ اللہ کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔

پھر یہاں تک کہ:۔

لا یقولن احدکم عبدی وامتی کلکم عبید الله وکل نساءکم اماء الله ولکن لیقل غلامی وجاریتی

تم میں سے کوئی کسی کو "میرا بندہ" یا "میری بندی" نہ کہے۔ تم سب لوگ اللہ کے "بندے" ہو اور تمہاری ساری عورتیں اسی کی "بندیاں"

وفتای وفتاتی ولا یقل العبد ربی ولکن لیقل سیدی وفی روایۃ لا یقل العبد لسیدہ مولای فان مولاکم اللہ

ہیں۔ بلکہ یوں کہے کہ میرا "غلام" اور "میری لونڈی" یا "میرا خادم" اور "میری خادمہ"۔ اسی طرح کوئی غلام اپنے آقا کو "رب" نہ کہے بلکہ "سید" کہہ کر پکارے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو مولانہ کہے کیونکہ تمھارا مولا صرف اللہ ہے۔

سلطنتِ جابرہ کی اقسام سلطنت جابرہ جس کا مفصل بیان اوپر ہو چکا ہے، دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک صورت اس کی یہ ہے کہ سلطانِ جابر اپنی شوخ چشمی اور گستاخی کے باوجود ایمان کی بھی کوئی رمق دل میں رکھتا ہے اور اس سے بعض اعمالِ صالحہ بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے اعمالِ صالحہ[1] طریقِ مشروع پر منطبق نہیں ہوتے، اور نہ اہلِ دیانت کے نزدیک ان کو کوئی وزن حاصل ہو سکتا ہے، کیوں کہ وہ ان کی انجام دہی کے لیے اپنا ہی ایک ڈھنگ نکالتا ہے اور اپنی ہی پسند کے مطابق اقدام کرتا ہے۔ لیکن دل میں وہ ان اعمال کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتا ہے اور پورے خلوص نیت سے انھیں بجالاتا ہے۔ مثلاً ہوا و ہوس کی راہ میں جس دریادلی سے اپنے خزانے لٹاتا ہے اسی کشادہ دلی سے ایک مسجد کی تعمیر پر بھی خرچ کرتا ہے اور اسے سونے چاندی کے نقش و نگار سے خوب مزین کراتا ہے اور اس کو مانی عبادت سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی مسجد بنانا خود اسراف میں داخل ہے اور اسراف شریعت میں حد درجہ مذموم فعل ہے اور اس وجہ سے خدا کے ہاں اس کی مقبولیت کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی، مگر چونکہ سلطان مسرف ہے اور اس کی رائے میں یہی اسراف انفاق فی سبیل اللہ ہے اور اسے سرانجام دیتے ہوئے وہ یہی یقین کرتا ہے کہ ایسے دینی کاموں میں جتنا زیادہ بڑھ چڑھ کے خرچ کروں گا اتنا ہی خدا کے ہاں مقبول ٹھہروں گا۔ ان خیالات کے ماتحت وہ تقرب الی اللہ کے لیے بیش بہا دولت لٹا دیتا ہے۔

دوسری صورت میں سلطان جابر کا دل خوف خدا سے بالکل ہی بے نصیب ہوتا ہے اور وہ اعمال شرعی کو اخلاص سے انجام نہیں دیتا بلکہ کچھ بطورِ عادت اور کچھ دنیاوی شہرت یا اہل زمانہ پر تفوق کے لیے بعض احکام شریعت کی اطاعت کر لیتا ہے اور اس پابندی شرع کو جاہ و جلال کا لازمہ سمجھتا ہے۔ پس صورت اول میں تو سلطان کے اعمال کی ظاہری شکل مردود تھی اور اس کی نیت محمود، مگر اس دوسری صورت میں باہر بھی کھوٹ ہے اور اندر بھی کھوٹ!

چند ضروری نکات ذیل میں سلطنت جابرہ کے متعلق چند اہم نکات بیان کیے جاتے ہیں جن سے سلطان جابر کی حیثیت کو سمجھنے اور اس کے ساتھ معاملہ کرنے کی حدود کو متعین کرنے میں آسانی ہو گی۔

نکتۂ اول:۔ سلطان جابر کے متعلق یہ تو قطعی ہے کہ وہ خدا کے ہاں تو بالکل مردود و مقہور ہے، لیکن اس کے وجود سے جماعت مومنین کو کسی قدر فائدہ ہوتا ہے اور کفر کو اس کے ذریعے نقصان پہنچتا ہے، مثلاً وہ سلطنت کے قیام کے لیے مسلمان

[1] نیکی اور تقویٰ اور صالحیت حدود شرعی کے باہر کہیں نہیں پائی جاتی۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کی شریعت سے آزاد ہو کر آپ اپنے نیک ارادوں کو جس طرح چاہیں پورا کریں، نہیں بلکہ اسلام کی شریعت سے بے نیاز ہو کر اگر آپ لاکھ تسبیحیں روز پڑھیں اور کروڑوں سجدے دن رات میں کر لیں تو بھی آپ متقی اور صالح نہیں ہیں۔ تصوف نے غلطی اگر کی تو یہی کہ تقویٰ کی راہ کو شریعت اسلام کی حدود و قیود سے آزاد کر دیا۔ شاہ صاحب نے موقع بہ موقع پر بات واضح کر دی کہ ایسے "اعمال صالحہ" کو جو طریقۂ مشروع پر منطبق نہ ہوں مومن کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں مل سکتی۔ (ن - ص)

اہل دماغ کو وزیر و امیر مقرر کرے گا اور کافر بادشاہوں کی بیخ کنی کی فکر کرے گا۔ یہ ضروری ہے کہ اس مسلم پروری کی اصل علت اتباع دین نہیں ہے اور اس کا فرکشی کی وجہ اعلائے کلمۃ اللہ کا ارادہ نہیں ہے، اور اس وجہ سے عاقبت اندیشانہ نقطۂ نظر سے خود اسے تو کوئی فائدہ نہ ہوگا مگر دین اور اہل دین کا کچھ نہ کچھ بھلا ہو ہی جائے گا۔ ایسے سلطان کو "اندھا مشعلچی" یا "خدمتگار قیدی" سمجھنا چاہیے کہ دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے مگر وہ اپنے آپ سے نفع نہیں پا سکتا۔ اس کے نیک کاموں میں حصہ لینے سے انکار نہ کرنا چاہیے اور حتی الوسع اس سے تصادم نہ کرنا چاہیے۔ بس درگاہ الٰہی سے اس کی اصلاح احوال کی دعا کرنی چاہیے اور اس کی طرف سے جو ظلم و تعدی ہو اسے بلائے آسمانی سمجھ کر صبر کر لینا ہی مناسب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان اللہ تبارک وتعالیٰ یقول انا اللہ لا الٰہ الا انا مالک الملوک قلوب الملوک فی یدی وان العباد اذا عصونی حولت قلوبھم بالسخط والنقمۃ فساموھم سوء العذاب فلا تشغلوا انفسکم بالدعاء علی الملوک ولکن اشغلوا انفسکم بالذکر والتضرع کی اکفیکم ملوککم

اللہ تبارک وتعالیٰ کہتا ہے کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سارے بادشاہوں کا مالک ہوں، ان کے دل میرے ہاتھ میں ہوتے ہیں، جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان بادشاہوں کے قلوب کو غصہ اور غضب کی طرف پھیر دیتا ہوں اور وہ ان کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ایسے وقت میں تم ان کے حق میں دعائے بد کرنے نہ جاؤ بلکہ مجھ کو یاد کرنے اور میرے سامنے گڑگڑانے میں مشغول ہو جاؤ تاکہ میں تم کو تمہارے ظالم بادشاہوں سے بچا دوں۔

نکتۂ دوم:- سلطان جابر چونکہ اپنے طور پر یہی سمجھتا ہے کہ وہ مسلمان ہے اس وجہ سے کبھی کبھی حمیت دینی اور غیرت شرعی اسے اعلائے کلمۃ اللہ پر اکسا دیتی ہے۔ ایسی صورت میں دین و شریعت کی شان بڑھتی ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان اللہ لیؤید ھذا الدین بالعبد الفاجر

یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو بدکار و فاجر کے ذریعہ بھی تقویت بخشے گا۔

خاص ان حالات میں اس کی اعانت و حمایت ارکانِ اسلام میں سے ہے اور یہ اعانت و حمایت گویا نبی صلعم کی سچی خدمت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:-

الجہاد ماض الی یوم القیمۃ لا یبطلہ عدل عادل ولا جور جائر

جہاد قیامت تک جاری رہے گا، اس کو نہ تو کسی عادل کا عدل باطل کر سکے گا نہ کسی ظالم کا ظلم۔

نکتۂ سوم:- بلاشک سلطان جابر امر بالمعروف کا محتاج ہے اور اس کے سامنے حق کو واضح کرنا ایک اونچے درجہ کی عبادت ہے، جیسا کہ ارشاد نبوت ہے کہ:-

افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر

سب سے بڑا جہاد ظالم بادشاہ کے روبرو حق بات کا کہہ دینا ہے۔

لیکن یہ امر بالمعروف ایسے مناسب طریقہ سے ہونا چاہیے کہ نوبت مخالفت اور کشمکش تک نہ پہنچے اور بغاوت نہ برپا ہو جائے کیونکہ امام جابر کے خلاف علم بغاوت اٹھانا جائز نہیں ہے[1] جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے:-

---

[1] یہ ایک نازک مسئلہ ہے مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس میں شاہ صاحب سے اختلاف ممکن ہے، یعنی بغاوت اور "انارکی" کی اجازت شریعت نہیں دیتی مگر مخالفت و مناقشت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جس کی بے شمار شکلیں ہیں۔ اگر نظام اسلامی تباہ ہو رہا ہو تو اسے ہموار کرنے کے لیے "غیر خونی انقلاب" کا راستہ اختیار کرنے میں کیا حرج ہے (ا۔ص)

الا من ولی علیه وال فرآه یاتی شیئاً من معصیة الله فلیکره ما یاتی من معصیة الله ولا ینزعن یداً عن طاعته[1]

دیکھو! سن رکھو! جس کسی پر کوئی حاکم مقرر ہوا اور وہ اس حاکم کو کسی معصیت کا مرتکب ہوتا ہوا دیکھے تو چاہیے کہ اس کو برا سمجھے لیکن اس کی اطاعت سے منہ ہرگز نہ موڑے۔

۲۔ سلطنت ضالہ

سلطنت جابرہ جب زیادہ عمر کی ہو جاتی ہے اور جبر پیشہ سلاطین متواتر ایک ہی طریق جبر و کبر پر نظام اجتماعی کو چلاتے رہتے ہیں تو کارگاہ سلطنت میں دورِ خاتم الانبیاء سے پہلے کا زمانۂ جاہلیت ابھر آتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خلافت راشدہ اور سلطنت عادلہ کے طور طریقے بھولے بسرے خواب ہو جاتے ہیں اور حکومت و سیاست کے الفاظ بولنے سے یہی سلطنت جابرہ متصور ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی صاحب ایمان و دیانت نظام حکومت میں حصہ لینے کو طاعت و عبادت شمار نہیں کر سکتا بلکہ الٹا وہ اسے دنیا کی بدترین صورت اور مستی و سرکشی کا سب سے زیادہ رذیل ڈھنگ قرار دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکابر ملت امور سیاسی سے دور دور رہتے ہیں اور سلاطین کی مجالست و مصاحبت سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ ادھر فرعون صفت سلاطین کو چھٹی مل جاتی ہے کہ نفس امارہ کے پیچھے بے روک ٹوک جہاں تک جا ہیں بھاگتے چلے جائیں اور نخوت و غرور کی وادی میں ترکتازیاں دکھلاتے رہیں۔ بس پھر ان کی اور ان کے ساتھیوں کی عقلیں فسق و فجور کے تخیلات میں غوطہ زن رہتی ہیں اور ان کے موضوع فکر یہ ہوتے ہیں کہ کس کا مال کس طرح اڑانا ہے، خزانہ کس طرح بھرا جائے، فلاں عامل کو معزول کیونکر کریں، فلاں شخص کو کونسا منصب دیں، رعیت کو کن نئی بندشوں میں جکڑیں، اپنا ٹھاٹھ جمانے اور رعب بٹھانے کے لیے کونسے نئے طریقے اختیار کریں، وغیرہ۔ اس طرح جباری کے اصول و فروع بنتے چلے جاتے ہیں اور پہلے کے کام کو ہر نیا آنے والا چند قدم اور آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ یہ فن مکروہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اب ریاست حکمی کے ہر معاملے سے شرع شریف کی مخالفت ثابت ہوتی ہے اور ہر معاملہ کے لیے دین کے حکم کے مقابلہ میں ایک نیا حکم آموجود ہوتا ہے۔ صاف بات یہ کہ رفتہ رفتہ ملت مصطفوی کے مقابلہ میں ایک نئی ملت پیدا ہو جاتی ہے اور سنت نبوی کے متوازی ایک نئی سنت کھڑی ہو جاتی ہے اور قوانین الٰہی کی جگہ لینے کے لیے قوانین انسانی نمودار ہو جاتے ہیں۔ شرع الٰہی میں جو باتیں حرام ہیں وہ شریعت سلطانی میں واجب ہو جاتی ہیں اور اسی طرح وہاں جو کچھ واجب ہے وہ یہاں ممنوع قرار پاتا ہے۔ مثلاً "شاہ شاہاں" "خداوند جہاں و جہانیاں" "حضور اقدس" "عرش آشیانی" "بندۂ خاص" "پرستار اختصاص" "ظلم قدر توام" وغیرہ الفاظ کا استعمال، یا امرا کا سر جھکا کر دست بستہ کھڑے ہونا یا رقص و سرود کی مجالس کے ہنگامے یا عید اور جشن وغیرہ مواقع پر ریشمی لباس پہننا اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانا کھانا یا کفار کی عیدوں مثلاً نوروز، ہولی، دیوالی وغیرہ کی رسوم میں حصہ لینا اور ایسی ہی کتنی حرکتیں اور ہیں جو شریعت اسلامی میں قطعاً حرام ہیں، مگر بادشاہ صاحب کا قانون کہتا ہے کہ یہ سب کچھ کرنا لازم ہے۔ دوسری طرف "اسلام علیہم

[1] اس بحث سے تعلق رکھنے والی حدیثوں کا ذخیرہ اچھی طرح پرکھے جانے کے قابل ہے کیونکہ دور فتنہ میں بڑی بڑی کارستانیاں کی گئی ہیں۔ تاہم یہاں جو معصیت پیشہ حاکم کی اطاعت کا حکم ہے وہ اسی حد تک ہے کہ فتنہ کی نافرمانی تک نوبت نہ پہنچے۔ اصل ناری کو روکتا ہے، یعنی جب تک بغاوت شرعاً لازم نہ ہو جائے امرا کو صبر سے برداشت کرو لیکن جب شرعاً نظام حکومت بدلنا فرض ہو جائے تو سیدھی طرح لڑو مگر حکومت کے بھوکے ہو کر "لا تقولوا" کی صورت تباہ کن ہے۔ (ت۔ ج)

کا جواب[1] دینا، جماعت میں شریک ہونا، خدا کے ادنیٰ بندوں سے مروت و اخلاق سے پیش آنا، ہر مسلمان سے مصافحہ و معانقہ کرنا، وضع دار شرفا کی دعوت قبول کرنا، مسلمان عوام سے ربط رکھنا، بیت اللہ کا حج کرنا، خدا پرستوں کی خدمت کرنا، مجالس علم و ذکر کی شرکت کا اہتمام کرنا، کسی قوی یا ضعیف کی مخالفت سے باز رہنا اور اہل حاجت کی غرض سننا وغیرہ امور جو شریعت الٰہی میں واجب العمل ہیں مگر قانون سیاسی انھیں حرام ٹھہراتا ہے۔

اور آگے چلیے۔ تجارت پر زکوٰۃ سے زائد ٹیکس مقرر کر دینا اور دریائی و صحرائی گذر گاہوں اور شہروں کے دروازوں پر مردم آزار بدمعاش کو اس غرض کے لیے بٹھا دینا کہ وہ مسافروں کی پکڑ دھکڑ کرتے رہیں اور ان کی تلاشیاں لیں اور ان کے مال میں سے ایک حصہ مار لیں۔ یہ سب خلاف اسلام ہے۔

پھر کتنے جرم ہیں کہ ان کی سزا شریعت ربانی میں کچھ ہے اور آئین سلطانی میں کچھ۔ مثلاً چوری کی حد اسلام میں قطع ید ہے مگر بادشاہی قانون چور کو قتل اور حبس کی سزا دیتا ہے۔ پھر شریعت کے قانون وراثت کی رو سے بادشاہ کے بھائی اس کے ترکہ میں حصہ دار ہیں مگر قانون سلطنت انھیں محروم قرار دیتا ہے۔ پھر بیت المال از روئے شریعت تمام مسلمانوں کا ہے مگر قانوناً بادشاہ اس کا مالک ہے۔

بہرحال یہ قصہ طولانی ہے۔ مدعا تو یہ واضح کرنا ہے کہ شریعت کے مقابلہ میں کس طرح قسم قسم کے احکام و ضوابط سلاطین اور ان کے مشیر گھڑ لاتے ہیں۔ پھر ارکین سلطنت اور وزرائے حکومت ان ہی احکام و ضوابطِ انسانی کی تعلیم رواج پا جاتی ہے اور اس کے بعد باپ جو اپنی اولاد پر شفقت کا حق ادا کرنا چاہتا ہو اپنے بچوں کے لیے اسی مقبول تعلیم کا انتظام کرتا ہے اور اسی کے ماہرین کو ان کا اتالیق مقرر کرتا ہے[2]۔ لوگ اسی مروجہ سیاست و قانون کی تعلیم کا نام کمال رکھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ پھر خیر خواہانِ سلطنت جو تحریر و تقریر اور بحث و مباحثہ کے ماہر فن ہوتے ہیں انھی مروجہ فنون پر کتابیں مرتب کرتے ہیں اور اس سرمایۂ خرافات کو منطقی دلائل و شواہد سے بزعم خود صحیح ثابت کر دیتے ہیں جیسے کہ لباس حریر کو حلال کرنے کے لیے ایک مشہور رسالہ لکھا گیا تھا یا جیسے سلاطین کے لیے سجدہ کو جائز قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ اس فن کی جامع کتاب آئین اکبری ہے اور اس کے ساتھ دین الٰہی کے نام سے اکبری مذہب کے اساسی اصول، مذاہب کے ادبستان میں محفوظ ہیں۔

[1] شاہ صاحب اپنے زمانے کے قریب کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے اور یہاں بطور مثال جن جن باتوں کا موصوف نے تذکرہ کیا ہے وہ اس دور میں جانی پہچانی باتیں تھیں۔ دراصل اسلام کو جن لوگوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہو یا جس سوسائٹی کی اصلاح منظور ہو اس کے مخصوص حوال اور اس کی مخصوص تاریخ کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام کے اصولوں کی تبلیغ اور کفر کے رسوم کی تردید دونوں کے لیے مثالیں وہ لینی چاہئیں جو لوگوں کے ارد گرد چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوں۔ مثلاً آج اگر دعوت حق کا کام کرنا ہے تو حکومت تو مسلمانوں کی ہے نہیں کہ اس کے ضوابط و رسوم پر بحث ہو۔ آج تو جماعتوں اور اداروں اور خانقاہوں اور مدرسوں کے آئین و دستور پر گفتگو کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ (ن۔ ص)

[2] ذرا آج کل کے "باپ" بھی گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ان کا رویہ آج کیا ہے؟ وہی جو اکبر اور محمد شاہ کے دور میں تھا: یعنی جس کمال کی قدر سلطنت کی طرف سے ہو رہی ہو، اسی کو بچوں میں پیدا کرنا ہے، چاہے وہ کمال غلامی ہو یا کمال کفر!

(ن۔ ص)

مختصر یہ کہ یہ سیاستِ سلطانی مذہب اسلام سے الگ ایک مستقل مذہب ہے اور ملت نبوی سے علیحدہ ایک ملت ہے، جیسے کہ ہندوؤں، مجوسیوں وغیرہ کے مستقل مذاہب باطلہ ہیں۔ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ سیاسی مذہب باطل شیعوں اور خارجیوں وغیرہ کے مذاہب کے درجہ میں ہے، جی نہیں! ان فرقوں کے مذاہب باطل سہی، مگر بزعم خود ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہم کتاب و سنت سے اپنا مذہب لیتے ہیں، لیکن یہ گمراہ سلاطین تو اپنے ضوابط کو کتاب و سنت سے ماخوذ ماننے کا لفظی دعویٰ بھی نہیں رکھتے، بلکہ سلطنت کے قیام اور مملکت کے نظم کے لیے فقط اپنی عقل کے فیصلوں پر حکم دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے نظامہائے قانون فلسفیانہ مذاہب میں تو گنے جا سکتے ہیں لیکن ملتِ اسلامیہ کے دائرے میں ان کا شمار کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسے بدراہ سلاطین کے متعلق خبر دے چکے ہیں کہ:-

انما اخاف علی امتی الائمۃ المضلین

مجھ کو جو ڈر ہے وہ یہ کہ میری امت پر گمراہ کن حکمران مسلط ہو جائیں گے۔

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ:-

قال قلت یا رسول اللہ ایکون بعد ھذا الخیر شر کما کان قبلہ شر؟ قال نعم! قلت فما العصمۃ؟ قال السیف! و قلت وھل بعد السیف بقیہ؟ قال نعم تکون امارۃ علی اقذاء و ھدنۃ علی دخن! قلت ثم ماذا؟ قال ثم ینشأ دعاۃ الضلال۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا اس خیر کے بعد پھر شر آئے گا جیسا کہ اس سے پہلے تھا؟ فرمایا "ہاں"! میں نے پھر دریافت کیا کہ اس وقت پناہ کس چیز میں ملے گی؟ جواب دیا کہ "تلوار میں" پھر پوچھا کیا اس خونریزی کے بعد بھی کچھ باقی رہ جائے گا؟ ارشاد ہوا "ہاں، ایسی امارت قائم ہوگی جس کی بنیاد میں تنکوں کا فساد اور ارادوں کی کشمکش پوشیدہ ہوگی اور ایسی صلح و آشتی معرض وجود میں آئے گی جس کی تہوں میں اک طوفان ہوگا"۔ میں نے کہا "پھر کیا ہوگا؟" فرمایا "اس کے بعد ضلالت کے داعی پیدا ہوں گے"

نیز ارشاد فرمایا:-

تکون فتنۃ عمیاء صماء علیھا دعاۃ علی ابواب النار

ایک اندھا بہرا فتنہ اٹھے گا جس کے داعی آگ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اس کی طرف بلائیں گے۔

بلاشبہ اس قسم کے سلاطین کفار اشرار کے گروہ میں سے ہوتے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، لیکن چونکہ زبان سے اسلام کے مدعی ہوتے ہیں، اس وجہ سے ان کا کفر ان کے اعلانِ ایمان کے پیچھے مستور رہتا ہے۔ وہ اس ظاہری دعویٰ ہی کی تصدیق کے لیے اسلام کے کچھ طور طریقوں اور رسموں کی پابندی کرتے ہیں، مثلاً نکاح، ختنہ، عیدین پر اظہار زینت، مسلمانوں کی طرح مردوں کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ اور قبروں میں دفنانے کا اہتمام وغیرہ۔ الغرض شریعت کا دامن صاف طرح سے چھوڑ نہیں دیتے۔ لیکن اپنے سلطانی دین و آئین ہی کو اپنے لیے اور اپنے خدم و حشم کے لیے واجب العمل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے خاص محاورات وضع کرتے ہیں جن میں شریعت اور آئین سلطانی دونوں کے ضوابط گڈمڈ ہو سکیں، مثلاً کہتے ہیں کہ اصل قانون تو شریعت کا قانون ہے مگر میدان سیاست میں شریعت کے ساتھ "طورہ" کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس "طورہ" سے مراد ہوتا ہے چنگیز خانی قانون۔ سو عملی کفر کے ساتھ یہ جو اسلام کا لیبل برقرار رکھا جاتا ہے یہ ظاہر شریعت کی رو سے انھیں مسلمانوں کا ایک فرد بنائے رکھتا ہے۔ آخرت میں مواخذہ کے لیے یقیناً ان کا کفر مخفی کافی ہے لیکن دنیا میں ان سے مسلمانوں کا سا معاملہ

کیا جائے گا۔ خواہ وہ قیامت میں کفار، اشرار کے ساتھ دوزخ کی گہرائیوں میں دائماً جلنے والے ہوں یا رحمت الٰہی انھیں عذاب سے پہلے یا عذاب کے بعد بخش دے، ہمیں اس سے بحث نہیں، یہ معاد کا معاملہ ہے جو خدا کے سپرد ہے البتہ امور معاش میں ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

فی الجملہ جب سلطنت جابرہ بگڑ کر سلطنت ضلالت بن جاتی ہے تو اس کا قدم فسق و ظلم کی سرحد سے آگے بدعت و ضلالت کی وادی میں جا داخل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے سلاطین مضلین کی حیثیت وہی ہے جو مختلف بدعتی فرقوں سے باطلہ کی ہے اور جیسا اختلاف مبتدعین کی تکفیر و عدم تکفیر میں پیدا ہوا ہے ویسا ہی اختلاف سلاطین مضلین کی تکفیر و عدم تکفیر کے مسئلہ میں بھی ہے۔ ایسے موقع پر احتیاط لازم ہے اور کوئی فیصلہ دینے میں تامل کرنا چاہیے۔

سلاطین مضلین کی دو قسمیں سلاطین مضلین کی بھی دو قسمیں ہیں، ان میں سے کچھ تو متمردین ہوتے ہیں اور کچھ مقلدین۔ اس تقسیم کی حقیقت یہ ہے کہ آئین سلطانی جب سوسائٹی میں ایک مذہب کی طرح جاری و ساری ہو چکتا ہے اور اس کی خوب شہرت ہو جاتی ہے تو بعض سلاطین متاخرین اگرچہ اپنی اصل جبلت کی رو سے عیش و نشاط کی طرف راغب نہیں ہوتے اور نہ انھیں جبر و تکبر کا طریقہ مرغوب ہوتا ہے، لیکن محض آئین اسلاف کی رعایت سے اور کچھ رسم و عادت کے طور پر لکیر کی فقیری کرتے ہیں۔[1] اس حال میں کہ ان کا دل اس سے نفرت رکھتا ہے۔ وہ اکثر قوانین سلطانی کے باطل ہونے پر یقین رکھتے ہیں مگر چار و ناچار انہی کو نافذ کرتے ہیں۔ اگر ان کے دلوں کو چیر کر دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ قوانین شریعت کے مقابلہ میں آئین ریاست ان کے نزدیک زیادہ قابل احترام ہے اور خدائے ذوالجلال کی محبت سے ان کی محبت مال و منال بڑھی ہوئی ہے اور خدا کے احکام کو نظر انداز کرنے سے اپنے منصب سلطانی کا تحفظ زیادہ عزیز ہے۔ ایسے سلاطین کو ہم سلاطین مقلدین کہتے ہیں۔

دوسری طرف وہ سلاطین ہیں جو خلقی طور پر عیش و نشاط اور تجبر و تکبر کے دلدادہ ہوتے ہیں اور ایمان کی حقیقت سے قطعی بے بہرہ۔ ان کی اس افتاد مزاج کے ساتھ آئین اسلاف بھی سازگاری کرتا ہے تو ان کی عیاشی اور جباری کی شان دوبالا ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ آئین سلطانی کو خوب چمکاتے ہیں اور اس کی رونق کو حد کمال تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ دین شاہی کے مجتہد اور سنت سلطانی کے مجدد ہوتے ہیں۔ ہم ان کا امتیازی لقب سلاطین متمردین تجویز کرتے ہیں۔

سلطانِ مضل کی حیثیت اب یہاں سلطان مضل کی حیثیت کے تعین کے لیے چند اشارات پیش کیے جاتے ہیں۔

نکتۂ اول: یہ سلطان مضل کے رئیس المضلین اور امام المبتدعین ہونے میں کیا شک ہے۔ اس کی ریاست دین کے حق میں زہر ہلاہل اور اس کی امامت کتاب و سنت کے حق میں تباہ کن ہے، لیکن چونکہ امور اسلامی میں مسلمانوں کو اسی سے پالا پڑتا ہے اس لیے

---

[1] سوسائٹی میں جو طور طریقے اور جو آئین و ضوابط مقبول ہو جاتے ہیں، ان کی قوت اتنی زبردست ہوتی ہے کہ "بادشاہ" تک ان کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس سے دو نکات اخذ ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ریاستی نظم کی اصلاح کے لیے رائے عامہ اور سوسائٹی کو اپنے ڈھب پر لانا چاہیے اور دوسرے یہ کہ باطل کا سدباب اس سے پہلے کرنے کی فکر کی جانی چاہیے کہ وہ سوسائٹی میں مقبول اور نافذ ہو جائے۔ اسی نکتہ کی بنا پر ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے سربراہ کاروں کی لغزشوں پر چشم پوشی کے بجائے انھیں درست کرنے میں چستی دکھانی چاہیے۔ (ن۔ ص)

اس کی تکفیر کا مسئلہ پیچیدہ ہے اور اس کے خلاف علمِ بغاوت اٹھانا یا اس کی اطاعت سے انکار کر دینا ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ پس محتاط[1] لوگوں کو خود بغی و خروج سے بچنا چاہیے اور اگر کوئی دوسرا اقدام کرے تو اسے ملامت بھی نہ کرنی چاہیے۔ جیسا کہ علمائے اہل سنت نے رافضیوں پر خود تلوار نہیں اٹھائی اور اگر علمائے ماوراء النہر نے اسے روا ٹھیرایا تو اس پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ سلاطین مضلین پر بغی و خروج کو ناجائز ماننے کے بعد ان کی سلطنت کو اقسامِ امامت ہی میں گننا لازم آتا ہے۔

نکتۂ دوم:۔ سلطان مقلد ملتِ اسلام سے نسبتہً زیادہ قربت رکھتا ہے، اس وجہ سے اس کی مخالفت میں بے باک نہ ہونا چاہیے۔ اس سے کشمکش کرنا اور اس کی اطاعت کا انکاری ہونا اگرچہ ظاہرِ شریعت کی رو سے موجب الزام نہیں ہے مگر مصلحت وقت کے خلاف ہے۔ ہاں اگر اس کی ریاست کو تہ و بالا کرنے سے خلافتِ راشدہ یا سلطنت عادلہ کا قیام متیقن[2] ہو تو قتل و مقاتلہ کا جھنڈا اٹھانا اور اس گمراہ مبتدع کو اقتدار سے ہٹانے کی کوشش کرنا اسلام اور فرزندانِ اسلام کے لیے مفید ہے، ورنہ بے نتیجہ شورش عوام و خواص سب کے لیے مضر ہے۔

۴۔ سلطنتِ کفر

یہاں سب سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ سلطنت کفر سے مراد خاص کافروں کی قائم کردہ حکومت نہیں ہے بلکہ اس اصطلاح سے ایسی حکومت مراد ہے جسے چلانے والے اپنے آپ کو مسلمانوں[3] میں شمار تو کرتے ہوں لیکن ان سے کھلے ہوئے

---

[1] اس احتیاط کی کوئی حد بھی ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظم پارہ پارہ ہوتا چلا جائے مگر دم سادھے لوگ بیٹھے رہیں۔ دراصل اسی احتیاط نے ہماری پچھلی تاریخ کو صدیوں تک وادی ضلالت میں بڑھتے چلے جانے کا موقع دیا۔ محتاط لوگ ریاست کی اصلاح کے لیے قوت کے استعمال کی اجازت اس وقت دیتے ہیں، جب نہ قوت پانے کا موقع رہتا ہے اور نہ قوت استعمال کرنے کا۔ آغاز مرض میں علاج آسان ہوتا ہے، لیکن اس وقت تو حضرات صبر کر کے بیٹھے رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ پھر جب مرض کا طوفانی دورہ شروع ہوتا ہے تو علاج کی اجازت دیتے ہیں بلکہ بعض تو عالم نزع طاری ہونے سے پہلے طبیب کو مریض کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ ہم اس احتیاط کے قائل نہیں، البتہ اسے صحیح مانتے ہیں کہ مرض کے مختلف مدارج میں مختلف تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور اسی اصول پر تعجب ہوتا ہے کہ اکبر اور محمد شاہ تک کے ادوار میں ہمیں صرف کلمۂ حق کے کہہ دینے کی اجازت ملتی ہے۔ حالانکہ یہ تو مرض کی انتہائی صورت ہے اور اس کے ازالہ کے لیے منظم تحریک کی ضرورت ہے (ن ص)

[2] یہاں تیقن سے مراد یہ ہے کہ اس کا ظن غالب ہو اور اس کا امکان ثابت ہو۔ ہم بھی اس بات میں شاہ صاحب سے متفق ہیں کہ کسی حالت میں انقلابی سرگرمیوں کی اجازت اگر دی جا سکتی ہے تو اس شرط کے ساتھ کہ ریاست کی اصلاح ہو جانے کا امکان غالب ہو (ن ص)

[3] یہاں سے یہ نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ کسی فرد کے مسلمان کہلانے کے ساتھ اس بات کا امکان ہے کہ جس ادارے کو یا جس تحریک کو وہ چلا رہا ہو وہ کفر کا ادارہ یا کفر کی تحریک ہو۔ پھر اس نکتہ کی روشنی میں موجودہ مسلمانوں کو اپنے اجتماعی مشاغل پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ وہ اگرچہ مسلمان ہیں مگر کیا ان کی جماعتیں، ان کی تحریکیں، ان کے سیاسی ہنگامے، ان کے علوم و فنون، ان کے مدرسے، ان کی صحافت اور ان کے پیشے بھی مسلمان ہیں یا نہیں؟ (ن۔ص)

موجبات کفر ظاہر کرتے ہوں اور ان کی طرف سے احکام شریعت کی اتنی مخالفت اور دشمنی سرزد ہوتی ہو کہ ان پر کفر و ارتداد کا حکم ثابت ہو جائے۔ بعض لوگ جبلتًا ملحد مزاج اور زندیق طبع ہوتے ہیں، اور بظاہر کلمۂ اسلام پڑھتے رہنے کے باوجود دوں میں خدا و رسول اور دین و مذہب اور حساب و کتاب پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کی نگاہ صرف دنیوی نشیب و فراز پر رہتی ہے اور جاہ و جلال اور مال و منال کو کمال زندگی شمار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ذہین و ذکی وہی ہے جو انہی الجھنوں میں الجھا رہے اور جن کو ان دنیوی سربلندیوں سے دلچسپی نہ ہو اسے یہ احمق و غبی شمار کرتے ہیں۔ جو چیز دنیائے دوں کے حصول کا ذریعہ نہ بن سکے وہ ان کے ہاں لغو شمار ہوتی ہے۔ اور جس کوشش سے ناموری اور شہرت حاصل نہ ہو وہ بے سود گنی جاتی ہے۔ اس نظریے کے ماتحت یہ حضرات تمام انبیاء اور راہ حق کے دیگر رہنماؤں کو جاہ طلب ہوشیاروں میں شمار کرتے ہیں اور ان کے پیروؤں کو عقل کے کورے قرار دیتے ہیں، جو کہ انبیاء کی (نعوذ باللہ) دلفریب باتوں میں آگئے اور ان کے خوشنما وعدوں میں گم ہو گئے۔ ظاہر بات ہے کہ جن لوگوں کے دل میں ایسے خیالات جمع ہوں وہ اعمال و اقوال میں کتاب و سنت کی رعایت کو حماقت ہی سمجھیں گے اور عادات و معاملات میں مذہب و ملت کی قیود کو بے وقوفی ہی جانیں گے۔ عبادتوں کی تکلیف اٹھانا اور عجز و توکل کی راہ پر گامزن ہونا انھیں کب مرغوب ہو سکتا ہے۔

ایسے لوگ جب تخت سلطنت پر براجمان ہوتے ہیں تو آئین سلطانی کو جو بظاہر سلطنت کا دبدبہ بڑھاتا ہے، فراست و کیاست پر مبنی سمجھتے ہیں اور شرع ربانی کو مضر مقصد پاکر احمقانہ رسوم کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ اس عقیدے کے ماتحت شریعت کے حق میں بدگوئی کرتے ہیں اور اپنے کارندوں کی نگاہوں میں اسے حقیر بناتے رہتے ہیں اور اس کی بیخ کنی کے لیے طرح طرح کے حیلے نکالتے ہیں۔ ہر معاملہ میں حکم سلطانی کو ترجیح دے کر حکم الٰہی کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اپنے حکم کے فوائد اور حکم الٰہی کے نقائص ثابت کرنے میں خوب چرب زبانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی ہر بات میں دین رب العٰلمین پر ایک چوٹ اور سنت سید المرسلین پر ایک تعریض ہوتی ہے۔ اور اپنی خرافات میں زور پیدا کرنے کے لئے وہ کبھی یاوہ گو شعرا کے اشعار اور علمائے جاہ طلب کی گھڑی ہوئی تمثیلات سے مدد لیتے ہیں اور کبھی فلسفیوں کے اقوال اور ملحدوں کے خیالات سے استدلال کرتے ہیں[1]

ایسے سلاطین کے متعلق بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سرکش کافروں اور زندیقوں اور مرتدوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے خلاف جہاد کرنا ارکان اسلام میں سے ہے اور ان کی تذلیل سید الانام کی سچی حمایت ہے۔ ان کی سلطنت قطعاً امامت حکمیہ کے زیر عنوان نہیں آتی۔ اور اس وجہ سے ان کی اطاعت کرنا شریعت کو ہرگز مطلوب نہیں ہے۔ اسی معنی پر عبادہ ابن صامت کی یہ روایت گواہ ہے کہ:-

بایعنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی ان — ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی ہے کہ حاکم وقت

---

[1] اس مقام پر شاہ صاحب نے سلاطین اسلام کش کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے ذرا موجودہ دور کے مسلمان اپنی شکلوں کو ملا کر دیکھیں، کیا ایک نقطے اور شوشے کا فرق بھی باقی رہ گیا ہے۔ ہاں ایک فرق ہے کہ وہاں سلطنت تھی اور یہاں غلامی ہے۔ (ن۔ ص)

[2] گمراہوں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ قرآن و حدیث کو سند مان کر احکام شرعی سے ٹھوس استدلال کرنے کے بجائے فلسفہ اور شاعری کے خرافات سے بات میں زور پیدا کرتے رہے ہیں۔ (ن۔ ص)

لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفراً بواحاً عندکم من اللہ فیہ برھان

سے منازعت نہ کریں الا آنکہ اس سے ایسے کفر صریح کا صدور ہو جس کے متعلق تمہارے پاس خدا کی کھلی ہوئی حجت موجود ہو۔

بعض حالات میں جب سلطانِ مرتد کو یہ خیال لاحق ہوجاتا ہے کہ عوام جو سعی بلیغ انبیاء و مرسلین کی اطاعت میں دکھا سکتے ہیں اور ان کی اطاعت کو جس طرح اپنی انتہائی سعادت شمار کرتے ہیں، اس طرح کی اطاعت ملوک و سلاطین کی نہیں کرسکتے، بلکہ اطاعت سلاطین کو ذلت و ننگ سمجھتے ہیں تو وہ دعوائے سلطنت کے ساتھ دعوائے نبوت کو بھی شامل کردیتا ہے تاکہ اہلِ خرد جاہ و مال کے لالچ میں آکر اور سادہ لوح فلاحِ عاقبت کے خیال سے اطاعت کیش بنے رہیں یوں ایک جدید مذہب گھڑا جاتا ہے۔ مگر بات نبوت کے دعویٰ پر ہی ختم نہیں ہوجاتی، تجبر و تکبر کا قدم اور آگے اٹھتا ہے اور دعوائے نبوت میں خدائی کا ادعا بھی شامل ہوجاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر سلطان مرتد کا کفر فرعون کے کان کاٹتا ہے۔ ایسی ناپاک سلطنت کفر کا قیام بالکل غلبۂ کفار کی حیثیت رکھتا ہے اور مسلمانوں پر اس کا وجود یہ لازم[۱] کردیتا ہے کہ وہ اس کے خلاف جہاد کریں اور اس طوفانِ فساد کو تلوار سے فرو کریں، یہ ممکن نہ ہو تو ایسے ناپاک دیس سے ہجرت کرجائیں بشرطیکہ کوئی دار الاسلام موجود ہو۔

یہاں جو سلطنت کفر زیرِ بحث ہے ایک فرضی صورت ہے۔ اس کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے کہ انہی دعوائے اسلام رکھنے والے سلاطین میں ایسا شخص بھی نمودار ہوسکتا ہے جو کافروبے دین، ملحد و مرتد ہو۔ ایسے شخص کا استیصال عین اسلام کا تقاضا ہے اور ہر صاحبِ اقتدار کی اطاعت کرنا اور ہر جبار کے آگے گردن جھکا دینا دین کا مدعا نہیں ہے۔[۲]

---

[۱] یہ فیصلہ ایسے نظام حکومت کے متعلق ہے جسے چلانے والا کم از کم نام کا "عبد اللہ" اور "محمد احمد" اور "محبوب علی" ہو۔ پھر معلوم نہیں کہ جہاں یہ نام کا اسلام بھی موجود نہ ہو وہاں کے مسلمان خالص حکومت کفر کو کیونکر قابلِ برداشت قرار دیتے ہیں اور اس کے کارندے بنکر کیسے اپنے تقویٰ کو محفوظ کرلیتے ہیں۔ (ن)

[۲] کیا لوگوں نے رفتہ رفتہ ٹھیک اسی غلط طریقہ کو دین نہیں بنا لیا اور ان کا عمل "وَاتَّبَعُوْا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ" کی شکل نہیں اختیار کرگیا ہے۔ نصوص قرآنی کی کیسی غلط تشریحیں و تاویلیں بلکہ کھلی ہوئی معنوی تحریفیں ہیں جو اس طریق مجرمانہ کے جواز کے لیے اختیار کی گئیں اور تاریخ کی کیسی کیسی دور از کار تعبیریں ہیں جو کفار کی اعانت و اطاعت کو برحق ثابت کرنے کے لیے استدلال کے تھیلوں سے نکالی گئیں۔ کاش کہ اب بھی لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں اور اب بھی انھیں ہوش آجائے کہ ابھی سنبھلنے کا وقت ہے۔ (ن۔ص)

نئی مطبوعات

روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	عہ	نماز کی حقیقت	۴ر
دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات	عہ مجلد عہ	اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں	۱۰ر
زندگی بعد موت	۱ر	نبوت محمدی کا عقلی ثبوت	۲ر
لباس کا مسئلہ	۳ر	قرآن فہمی کے بنیادی اصول	۳ر

فریضۂ اقامتِ دین

(از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی)

(۲)

اقامتِ دین کے امکان و عدمِ امکان کی بحث

عدم امکان کے قائلین اب اس گروہ کے خیالات کو لیجیے جو اس نصب العین ـــــ اس واحد فریضۂ حیات کی بجاآوری سے اس لیے کترا رہا ہے اور دوسروں کو بھی کترا کر چلنے کا مشورہ دے رہا ہے کہ بحالت موجودہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں اور دین کی اقامت کے لیے براہِ راست جدوجہد کرنا نہ صرف ضیاعِ وقت ہے بلکہ مفادِ ملی کے لیے تباہ کن بھی ہے، اس لیے عقل چاہتی ہے اور مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ فی الحال اس کا نام نہ لیا جائے اور اپنی ساری قوتیں کسی ایسے مورچہ پر صرف کردی جائیں جہاں سے ہم اپنے ماحول کے بدلتے ہوئے حالات پر اس حد تک اثر ڈال سکیں کہ آئندہ چل کر حالات ہماری اس جدوجہد کے لیے نسبتاً زیادہ سازگار ہو جائیں اور وہ دورِ سعید آجائے جس میں ہم بآسانی اپنے نصب العین کی طرف علانیہ مارچ کرسکیں۔

اس نظریہ پر غور کیجیے تو ذہن میں چند سوال پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) کیا اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے براہِ راست جدوجہد کرنے میں اس کی کامیابی کے امکان و عدمِ امکان کی بحث پیدا بھی ہوسکتی ہے؟

(۲) کیا دین کی اقامت واقعی ناممکن ہے؟

(۳) ناسازگاری حالات کی بنا پر اس منزلِ مقصود کی طرف پھیر کے راستوں سے پیش قدمی کرنے کی کوئی عملی مثال، کوئی انسانی تجربہ یا کوئی صحیح فکری بنیاد موجود ہے؟

انہی سوالوں کے صحیح جواب میں اس نظریہ کا سقم و صواب مستور ہے، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں کے طریقِ کار اور اسوۂ اعمال سے یہ جوابات حاصل کیے جائیں۔ اللہ کی کتاب سے اس لیے کہ اسی نے اپنے پیرووں پر یہ بارِ عظیم ڈالا ہے اور ساتھ ہی اس کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہے، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ تمام معاملات میں تو اس نے ہماری رہنمائی کی ہو اور اس معاملے کو تاریکی میں چھوڑ دیا ہو جو پورے صحیفۂ زندگی کا سرعنوان اور تمام فرائضِ دینی کا صدر نشین ہے اور اللہ کے رسولوں کے طریقِ کار اور اسوۂ اعمال سے اس لیے کہ ان پاکانِ خاص اور ان کے سچے اور کامل پیرووں کے سوا دنیا کسی ایسے انسان یا انسانی گروہ سے واقف نہیں ہے جس نے اس نصب العین کو اپنایا ہو۔

ادائے فرض بحث امکان سے بے نیاز ہے

قرآن مجید نے اس چیز کو کر اپنے منصب اور نصب العین کی خاطر جد وجہد بہر حال ضروری ہے اور اس میں انجام کی پروا کیے بغیر ہر وقت لگے رہنا چاہیے۔ اتنی وضاحت سے بیان کیا ہے اور انبیاء کرام نے اپنے عمل سے اس اصول زندگی کی ہمہ گیری اور صداقت کی ایسی روشن شہادتیں بہم پہنچائی ہیں کہ ایک منکر قرآن ہی اس کے انکار کی جرأت کر سکتا ہے۔ ہر نبی کو منصب رسالت پر مامور کرتے ہی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ لوگوں کے سامنے اس حقیقت اور اس مطالبہ کا اعلان کر دو کہ:۔

اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ	لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور "طاغوت" کے اتباع سے بچو
..... أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُوْنِ	..... میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کرو۔

چنانچہ اسی اعلان سے ہر نبی نے اپنی دعوت کی ابتدا کی۔ یہ چند حرفی اعلان در اصل اسی انقلابی مشن کا ایک اجمالی مینیفسٹو ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں اقامت دین کہتے ہیں۔ یعنی ہر نبی نے اُٹھتے ہی اپنے اس نصب العین کا اظہار کیا اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا اور خود اس کے لیے عملی سعی و جہد شروع کر دی کہ خدا کی زمین پر صرف اسی کا نازل کیا ہوا ضابطہ حیات نافذ ہو اور نافذ رہے۔ "عبادت" "الٰہ" اور "طاغوت" کے موجودہ بے جان تصورات کے پیش نظر اس بات کے اندر کچھ مذہبیانہ غلو محسوس ہوگا کہ ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہر نبی نے اقامت دین کی جد وجہد شروع کر دی۔ لیکن قرآن نے اس وہم کا خود ہی استیصال کر دیا ہے اور صاف صاف بتا دیا ہے کہ حاملین توراۃ و انجیل و قرآن ہی کو یہ فریضہ نہیں سپرد کیا گیا تھا بلکہ ہر نبی کا مقصد بعثت یہی تھا:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ إِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى أَنْ أَقِيْمُوا الدِّيْنَ (شوریٰ۔ ۲)	اللہ نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی (پیروی کی) نوح کو وصیت کی تھی اور جس کی (اے نبی) تمھارے اوپر وحی کی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ (وغیرہ تمام انبیاء اور ان کے پیروؤں) کو حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ اس دین کو قائم کرو۔

غرض قرآنی تصریحات گواہ ہیں کہ بلا استثناء ہر نبی کو اللہ واحد کے نازل کردہ دین کی دعوت اور اقامت کا فرض سپرد کیا گیا تھا اور پھر قرآن ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ ہر نبی نے اس امر الٰہی کی بجا آوری اس شان سے کی کہ نہ تو کبھی اس دعوت کے کامیاب ہونے پر خدا سے گارنٹی طلب کی، نہ ایک لمحہ اس کے انجام پر فکر و تامل میں ضائع کیا، نہ اس کے امکان اور عدم امکان کا ان کے ذہنوں نے سوال اٹھایا، نہ حالات کی ناسازگاری ایک آن کے لیے ان سے اس آواز کو سینہ میں دبا رکھنے کا مطالبہ کر سکی۔ بلکہ ہر ایک نے اپنی بعثت کی ابتدا سے زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے اس فرض کو پورا کیا۔ ان میں اگر کچھ ایسے تھے کہ ان کی دعوت الی الحق نے کامیابی حاصل کی اور وہ دنیا چھوڑنے سے پہلے سچے خدا پرستوں کا ایک گروہ پیدا کر گئے تو متعدد ایسے بھی تھے جن کی آواز آخر تک بے حس دلوں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہوتی رہی۔ نوح علیہ السلام نے تقریباً ایک ہزار سال کے لیل و نہار اس ادائے فرض میں صرف کر ڈالے مگر اس طویل اور صبر آزما سعی کا انجام ان گالیوں اور پتھروں کی شکل میں نمودار ہوتا رہا جن سے ان کی "قوم" رات دن ان کو نوازتی رہتی تھی۔ اور جب ان کی ادائیگی فرض کا زمانہ ختم ہوا

تو ان کی دعوت قبول کرنے والوں کی تعداد گنتی کے چند افراد سے زیادہ نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے بڑھاپے کی عمر تک اس عبادت اللہ اور اجتناب طاغوت کا پیغام سنایا اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے لگاتار کوششیں کرتے رہے۔ اس کوشش اور پیغام رسانی کے دوران میں انھیں جن جن ابتلاؤں اور جانکاہ مصیبتوں سے گذرنا پڑا، ان کے تصور ہی سے دل کانپ اٹھتا ہے لیکن اس ساری تگ و دو اور ان پیہم قربانیوں کا ثمرہ یہ نکلا کہ ان کے اپنے اہل و عیال کے سوا مشکل ہی سے کوئی ان کی آواز پر لبیک کہنے والا تھا۔ حضرت لوط، شعیب، ہود، صالح اور عیسیٰ وغیرہ انبیائے کرام کے سوانح حیات میں کم و بیش اسی قسم کے حالات و مناظر دکھائی پڑتے ہیں۔ پھر اسی طائفہ میں حضرت یحییٰ اور انہی کی طرح کے کچھ دوسرے انبیاء بھی موجود ہیں جن کی تبلیغ ہدایت کا انجام یہ نظر آرہا ہے کہ کلمۂ حق سننے والا تو ایک فرد بھی نہ ملا لیکن کسی کی گردن پھانسی کے پھندوں میں دیدی گئی اور کسی کے سر پر آرے چلا دیے گئے ـــــ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا دور نبوت اس حقیقت کا سب سے بڑا شارح ہے۔ آپ کو اسی پیغام کے ساتھ، جو ہر نبی کو برائے تبلیغ ملا تھا اور اقامت دین کے اسی مشن کو دے کر، جس کو ہر نبی لے کر آیا تھا، مبعوث فرمایا گیا، ایک طرف تو یہ پیغام بھی پہلے کی بہ نسبت کامل اور وسیع المعانی تھا، دوسری طرف مخاطب ایک مخصوص سرزمین کے بجائے پورا ربع مسکون تھا۔ اور اس "ربع مسکون" کا حال یہ تھا کہ اس کے ایک ایک گوشہ میں طاغوت کا علم گڑا ہوا اور کفر و شرک کا اندھیر چھایا ہوا تھا۔ اس حال میں خدا کا یہ آخری پیامبر آتا ہے اور آتے ہی وہی بات بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنے لوگوں کو سناتا ہے جو ہر نبی سناتا آیا ہے۔ تدریجاً دعوت کا حلقہ وسیع ہو رہا ہے یہاں تک کہ پورے تین سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ اللہ کی جناب سے تبلیغ و اعلان عام کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ (حجر-۷) جس بات کا تجھ کو حکم دیا گیا ہے اس کو دانشگاف کہدو اور مشرکوں کی پروا نہ کرو

خدا کا نبی امتثال امر کے لیے فوراً تیار ہو جاتا ہے اور جو بات اب تک وہ اپنے عزیزوں اور قرابت داروں سے گھروں کے اندر اور دیواروں کے پیچھے سنایا کرتا تھا اسے اب پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ کر سارے عرب و عجم کو ہانکے پکارے سنانے لگا۔ سننے والوں نے جس طرح اس پکار کا جواب دیا اس کو مکہ اور طائف کی گلیاں قیامت تک نہ بھولیں گی۔ لیکن خدا کے اس فرض شناس بندے کو ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی، اس کو اگر پروا ہوتی ہے تو یہ کہ جس کلمۂ حق کی تبلیغ و تفہیم کا فریضہ مجھ پر عائد کیا گیا ہے اس کے سنانے سمجھانے میں کوئی کسر نہ رہ جائے اور جس صداقت پر ان گم کردہ راہوں کی فلاح و نجات منحصر ہے اس کو یہ سنتے اور مانتے کیوں نہیں! اس کی ساری تمنائیں اس ایک آرزو میں آکر سمٹ گئی ہیں کہ کسی طرح میری بات دلوں میں اتر جائے اور جس ہدایت کو اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ نازل فرمایا ہے اس کو یہ لوگ قبول کر لیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ہے کہ اس کو بار بار محبت کے ساتھ جھڑکتا ہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ تمہارا کام صرف پہنچا دینا اور کھول کھول کر امر حق بیان کر دینا ہے، اگر ایک شخص بھی اس امر حق کو سن کر نہیں دیتا تو اس کی کوئی پروا نہ کرو (فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ الْمُبِينُ) یہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر کچھ اپنا ہی بگاڑیں گے، تمہارا کچھ نہ بگاڑیں گے۔ تم اپنی اس دعوت کا کام انجام سے بے پروا ہو کر بجا لاتے رہو۔ یہ نہ سوچو کہ کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے اس دعوت کو کامیاب اور اس کے

دشمنوں کو تباہ و برباد دیکھو اور اس کا بھی امکان ہے کہ ایسا نہ ہو۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ (یونس) اور اے پیغمبر! جس عذاب کی ہم ان منکروں کو دھمکی دے رہے ہیں یا تو اس کا کچھ حصہ ہم تم کو دکھلا دیں گے (اور تمھاری نگاہوں کے سامنے ہی یہ اپنے انجام بد سے کسی قدر دوچار ہو لیں گے) یا تم کو وفات دے دیں گے۔ سو ہماری ہی طرف تو ان کو پلٹ کر آنا ہے، پھر (یہ یقین رکھیں کہ) ان کے سارے اعمال خدا کی نگاہ میں ہیں۔

بعثت محمدی پر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کیجیے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ ہدایت کے بعد ساری دنیا کا بالعموم اور قوم عرب کا بالخصوص، دو میں سے ایک نتیجہ ہونے والا تھا۔ یا تو وہ اس پر ایمان لا کر اللہ تعالیٰ کی رحمت بے کراں سے سرفراز ہو یا انکار کرکے ہمیشہ کی لعنت اور دائمی عذاب خرید لے۔ ایک معمولی انسان بھی اپنی قوم کو اس طرح نذر ہلاکت ہوتا دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا، کجا کہ وہ انسان جو محبت و رافت کا پیکر اور رحمۃ للعلمین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اکثر ناعاقبت اندیشوں نے اس حق کی تکذیب اور مخالفت کرکے ہلاکت کی راہ چلنی چاہی تو آپ کا دل خون ہونے لگا، اس فکر میں کہ کسی طرح یہ لوگ راہ راست پر آجائیں، زندگی کا ایک ایک لمحہ سخت قلق اور اضطراب میں گزرتا تھا، رات کی رات اس الحاح و زاری میں بسر ہو جاتی تھی کہ خدایا! اس قوم کو ہدایت دے، اس کے دلوں کی آنکھیں کھول دے کہ وہ تیرے غضب سے بچ جائیں۔ یہ جوش رافت اور جذبہ خیر سگالی اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ حالت شرک میں مرجانے والوں کے حق میں بھی دعائے استغفار کرنے سے آپ باز نہ رہ سکتے اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ اٹل فیصلہ سنا دیا کہ "ان کے لیے دعائے مغفرت نہ کرو، اگر تم ایک بار نہیں ستر بار استغفار کرو تو بھی میں ان کو بخشنے کا نہیں"، رحمت عالم کی زبان پکار اٹھی "خدایا! میں ان کے لیے ستر بار سے بھی زیادہ استغفار کروں گا"۔ آپ سے بڑھکر اس امر واقعہ کا کون ادراک رکھتا تھا کہ یہ قوم اس خطرناک آزمائش میں صرف میری بعثت کی وجہ سے ڈالی گئی ہے جس کا اگر ایک پہلو روح پرور ہے تو ساتھ ہی دوسرا پہلو جانگداز بھی ہے۔ اگر ایک طرف خلافت ارضی کی سرفرازیاں اور فردوس بریں کی بہاریں ہیں تو دوسری طرف غضب الٰہی کی ہلاکت خیزیاں اور عذاب جہنم کی الم ناکیاں بھی ہیں، اور قوم ہے کہ اسی دوسرے پہلو کو اختیار کرتی اور اسی دوسری طرف جانے پر اصرار کر رہی ہے۔ لیکن پیغمبر عالم یہ سارا دہشت ناک ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اپنے کو مجبور محض پا رہا تھا اور قوم کے درد میں تڑپنے کے باوصف اس صورت حال میں کسی ادنیٰ تغیر کی بھی مجال اور گنجائش نہ دیکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ میری ہی دعوت لا الٰہ الا اللّٰہ کا ثمرہ ہے کہ شاید یہ قوم عاد و ثمود کی طرح پیوند خاک کر دی جائے، ممکن ہے یہود کی طرح ابدی لعنت میں مبتلا ہو جائے، ہو سکتا ہے کہ جنگ و جدال کی نوبت آئے، بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگے، باپ بیٹے کے خون کا پیاسا ہو جائے، نسبی رشتے کٹ جائیں، خاندان تباہ ہو جائیں، وطن تاراج ہو جائے ـــــ لیکن ادائے فرض کی ناگزیری کا کیا علاج! سینہ بھنچتا ہے تو بھنچے، دل تفکر و تحسر کے ہجوم سے مضطرب ہے تو مضطرب رہے، کندھے اس بار گراں کے دباؤ سے شل ہوتے ہیں تو ہو جائیں، اور کمر اس بوجھ سے دو نیم ہو رہی ہے تو ہو جائے، مگر یہ کوئی اپنی سوچی ہوئی اسکیم تو نہیں ہے کہ ملتوی یا ترک کی جاسکے، یہ تو بھیجنے والے کا مقرر کیا ہوا "فریضۂ زندگی" ہے جس کو ہر حال میں پورا ہونا چاہیے ـــــ پیغمبر کے دل کے یہی سارے جذبات

ہیں جو ان آیات کے اندر جھلک رہے ہیں :-

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

(یونس - ۲)

اے پیغمبر، ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے اس بات کا ذرا استحقاق نہیں کہ بطور خود اس قرآن میں کوئی رد و بدل کر دوں۔ میں تو بس اسی چیز کا تابع ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھ کو ایک بڑے دن کی سزا کا ڈر ہے، اور کہو، اگر اللہ کو منظور ہوتا تو میں یہ قرآن تمھیں پڑھ کر سناتا ہی نہ اور نہ وہ تم کو اس کی اطلاع دیتا، چنانچہ اس سے پہلے میں تمھارے اندر ہی ایک عمر گزار چکا ہوں (اس وقت تو میں نے کوئی چیز تمھارے سامنے نہیں پیش کی تھی کہ اب یہ قرآن اپنے جی سے بنا کر تم کو سنانے لگا) کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

لوگوں کا ــــ "حالات زمانہ سے واقف" اور "مصلحت شناس" لوگوں کا ــــ مطالبہ یہ تھا کہ جس قرآن کو آپ پیش کر رہے ہیں اس کی تعلیمات ہماری قومی نفسیات سے میل نہیں کھاتیں نہ "احوال و ظروف حاضرہ" سے سازگاری رکھتیں، اس لیے اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے جس میں یہ "خامیاں" نہ ہوں۔ یا اسی قرآن میں کچھ اس طرح کی ترمیم و اصلاح کر دیجیے کہ اس ماحول میں ٹھیک فٹ ہو سکے (اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ اَوْ بَدِّلْهُ ۔ (یونس۔ ۲) ورنہ اگر آپ نے من و عن اسی قرآن اور اس کی تعلیمات کی تعلیم و ترویج پر اصرار کیا تو یاد رکھیے ایک فتنہ اٹھے گا اور قومی عمارت کے ایک ایک گوشہ کو تہ و بالا کر کے رکھ دے گا۔ پیغمبر یہ خطرہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، بلکہ وہ خطرہ بھی جو آنے والی زندگی سے متعلق تھا۔ ان دور بینوں کی تذکیر کا محتاج نہ تھا، مگر ساری بات کی ایک بات یہ تھی کہ آخر وہ کرتا تو کیا کرتا سوا اس کے کہ حسرت و اندوہ بھرے لہجے میں ان کو یہ سنا دے کہ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ الخ

یہ انبیاء کے ان احوال و سیر کے چند مشہور و مستند حقائق اور واقعات ہیں ، جو سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی عبرت پذیری اور حق نمائی کے لیے قرآن حکیم میں بیان کیے گئے ہیں، ان واقعات میں جو اصول حق سب سے زیادہ نمایاں اور جو نقش حقیقت سب سے زیادہ ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کے دین کی اقامت کے لیے کوئی شگون لینے کی ضرورت نہیں نہ حالات کی سازگاری کا کوئی اندازہ لگانے یا کامیابی کے امکانات ٹٹولنے کی گنجائش ہے۔ جو چیز ہمارا فریضۂ زندگی قرار پا چکی، وہ ہر حیثیت سے اس بات کی مستحق ہے کہ جب تک زندگی ہے اس کے لیے جد و جہد کرتے رہیے۔ وہ فرض، فرض نہیں جس کو مشکلات کے اندیشے منسوخ کر دیں، جو امکان و عدم امکان کی بحثوں کا زخم کھا سکے۔ اگر دعوت توحید اور اقامت دین کا کام شروع کرنے سے پہلے امکانات کا ٹٹولنا ممکن ہوتا تو یقین جانئے انبیاء کی ایک بڑی تعداد اپنے مشن کا اظہار تک کرتی اس کے لیے سعی و کوشش تو درکنار۔ کیونکہ عموماً ہر نبی توحید کی دعوت اور اقامت دین کا مشن لے کر دنیا میں بھیجا ہی اس وقت جاتا تھا جب حالات کی ناسازگاری اپنی انتہا کو پہنچ چکتی تھی، جب کلمۂ حق کا نشو و نما بظاہر ناممکن سے ناممکن تر ہو چکتا تھا، جب صدائے توحید بلند ہوتے ہی ہر طرف سے کنکر پتھر برسنے لگتے تھے۔ لیکن حالات کی اس شدید نامساعدت، مشکلات و موانع کی اتنی زبردست مزاحمت اور امکان کامیابی کی اس انتہائی قلت کے باوجود، جس سے ہم اپنے موجودہ حالات کا کوئی

مقابلہ نہیں کرسکتے۔ انھوں نے کشتی بحر ظلمات میں ڈال دی اور ذرا نہ سوچا کہ ساحل کہاں اور کدھر ہے؟ موسم پُرسکون ہے یا طوفانی؟ بادبان ٹھیک ہے یا نہیں؟ ہوا کا رخ کیا ہے؟ کشتی کھینے والے بازوؤں میں توانائی کتنی ہے؟ سمندر پیداکنار ہے یا ناپیداکنار؟ راستہ صاف ہے یا زیرِ آب چٹانیں ہیں؟ انھوں نے ان میں سے کسی بات پر بھی تامل نہ کیا۔

مشکلاتِ راہ اس فرض کی اہمیت کم نہیں زیادہ کرتی ہیں۔

اب اگر ہم نے انبیاء کے قصص و احوال کو مشرکین عرب کی طرح اساطیر الاولین کی حیثیت دے رکھی ہے اور ان کو زمانہ قدیم کی ایسی داستانیں سمجھ بیٹھے ہیں جن کی ہم اپنی زندگی کا سفر طے کرنے میں کسی قسم کی احتیاج نہیں رکھتے سوا اس کے کہ آیات قرآنی سمجھ کر محض حصول ثواب کے لیے ان کی تلاوت کرلینی چاہیے تب تو بات ہی اور ہے لیکن اگر واقعہ یہ نہیں ہے اور ہماری بدبختیوں نے ابھی تک ہم کو نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ کی حد تک نہیں پہنچا دیا ہے بلکہ ہم ان قصص کو اسی طرح مشعل ہدایت اور منبع اعتبار و بصیرت یقین کرتے ہیں جس طرح قرآن نے ہم کو بتایا ہے تو ہم انبیاء کی اس مقدس تاریخ کے ہر دور اور ہر ورق سے یہی ایک غیر متغیر اصول سیکھ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہمارے پروردگار نے ہمارا مقصد زندگی ٹھیرا دیا ہے اس کی خاطر جدوجہد ہر حال میں ہونی چاہیے۔ یہ جدوجہد یہی کہ یہ جدوجہد ہر حال میں ہونی چاہیے اور اس کے لیے مشکلات راہ اور ناسازگاری ماحول کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہ دیکھتے ہو کہ ہر نبی بالعموم ایسے وقت میں اس کام پر متعین کیا جاتا رہا ہے جب کہ حق و ایمان کی روشنی اس زمین سے بالکل مفقود ہوچکی تھی اور کفر و مادیت کی آفاق گیر تاریکی میں اس جدوجہد کے لیے امکان کامیابی کی کوئی کرن دور دور تک کہیں نظر نہیں آتی تھی، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ جدوجہد ایسے ہی ماحول سے مانوس ہے اور جس زمانہ میں لوگ حق سے جتنا ہی زیادہ بیگانہ ہوں، دہریت و مادیت کی جتنی ہی زیادہ گرم بازاری ہو اور طاغوت کی حکمرانی جتنی ہی زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور مستحکم ہو، علمبرداران حق پر اقامت دین الٰہی کا فریضہ اتنا ہی زیادہ اہم اور سنگین ہوجاتا ہے۔ اس لیے اگر حالات کا یہ صحیح اندازہ ہے کہ دنیا حق سے اتنی ہی برگشتہ اور متنفر ہوچکی ہے کہ اس کو دین حق کا نام بھی سننا گوارا نہیں تو یہ اقامت دین کی جدوجہد میں کسی تعطل یا تخفیف کا باعث نہیں ہے بلکہ اس میں انتہائی سرگرمی، جوش اور انہماک کا طالب ہے۔

فریضۂ زندگی کا مقام اہل کفر کی نگاہوں میں

زندگی کا یہ اصل الاصول کہ نصب العین کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ امکان و عدم امکان کی بحثوں کا متحمل نہیں ہوسکتا، ایسا مستحکم اور عالم گیر ہے کہ نہ صرف اسلام ہی نے اس کا اپنے پیرووں سے مطالبہ کیا ہے اور نہ صرف انبیاء اور ان کے سچے متبعین ہی نے اس پر عمل کرکے دکھایا ہے، بلکہ کافر دین اور خالص دہریوں تک کے یہاں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور وہ بھی فریضۂ زندگی کا مقام یہی سمجھتے ہیں کہ وہ حالات کی سازگاری اور ناسازگاریوں سے بے نیاز اور بہرصورت زندگی کے آخری سانس تک ایک سعی پیہم کا مستحق ہے۔ چنانچہ ان کی تاریخ میں اس کے بے شمار شواہد پائے جاسکتے ہیں:

مارکس کے پیرو اس کے چند مخصوص نظریاتِ زندگی پر ایمان لائے اور انہی نظریات کی "اقامت" میں انھوں نے مصائب انسانی کا علاج یقین کیا، اس لیے یہی چیز ان کی زندگیوں کا نصب العین قرار پاگئی اور انھوں نے اس کی ترویج عام کے لیے پوری قوت سے جہاد شروع کردیا، یہ جہاد اس مملکت میں شروع کیا گیا جس پر دنیا کی سب سے مستبد حکومت مسلط تھی

سے اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھی اور جہاں زار کی مطلق العنانیت اور مختاریت کے خلاف سانس لینا بھی بظاہر ممکن نہ تھا، مگر اشتراکی اصولوں پر معاشرہ اور حکومت کی تنظیم کو اپنا فریضۂ زندگی قرار دینے والوں نے ان مصائب و آلام کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں جو اس جدوجہد کے پردے میں چھپے انھیں گھور رہے تھے۔ جب زار کے کانوں تک ان کی سرگرمیوں کی اطلاع پہنچی تو وہ تہذیب و تمدن کے تمام دسلحوں سے مسلح ہو کر پوری خشمناکی کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا۔ کتنوں ہی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو موت کے چنگل سے بچے ان کو سائبیریا کے برفستانی جہنم میں جھونک دیا۔ ظلم اور ایذا دہی کی کوئی ایسی ممکن صورت نہ تھی جن سے ان کو سابقہ نہ پڑا ہو۔ سالہا سال تک یہی ہنگامۂ دار و گیر برپا رہا مگر کوئی بڑے سے بڑا حادثہ ان کے پائے عزیمت میں لغزش نہ پیدا کرسکا اور اشتراکیت کا عشق آلام و مصائب کے بیچ دھارے سے ان کو تیرا تا اور منزلِ مقصود کی طرف ان کے قدم بڑھاتا رہا۔

انہی اشتراکیوں میں آگے چل کر، جبکہ وہ زار کا تخت سلطنت الٹ کر اپنا اشتراکی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے، باہم اختلاف ہوگیا۔ لینن کی وفات کے بعد سیاست کی باگ ڈور اسٹالن کے ہاتھوں میں آگئی جس نے آہستہ آہستہ اشتراکی نظام سلطنت کو بین الاقوامیت کی سطح سے ہٹا کر قومی اشتراکیت کی سطح پر لانا شروع کیا۔ اس کی اس پالیسی سے جو دراصل اصول اشتراکیت سے صریح تجاوز اور ان کے ساتھ کھلی ہوئی غداری اور منافقت تھی، ٹراٹسکی نے اختلاف کیا اور اشتراکیت کی اصلی روح کے قیام اور خالص مارکسیت کی بقا پر زور دیا۔ اسٹالن نے نہ صرف اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا بلکہ اس کو اس جرم کی پاداش میں مجلس حل و عقد سے نکال باہر کیا، خفیہ پولیس نے اس کے اور اس کے حواریوں کے منہ بند اور ہاتھ پاؤں باندھ دیے، مگر وہ جن اصولوں کا عقیدت کیش تھا اور جن کے قیام و بقا میں اس کو خلائق کی فلاح نظر آرہی تھی، ان کی تبلیغ سے باز نہ رہا، آخر کار جلاوطن کر دیا گیا، امریکہ پہنچا اور وہاں سے اپنے اصولوں کی اشاعت کرنے لگا اور اپنے نصب العین کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کے مشن کے دشمن وہاں بھی پہنچے اور ایک روز خفیہ سازشوں کے ذریعہ اس کے سامنے موت کا پیالہ پیش کر دیا اور مارکسیت کے اس "مومن قانت" نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس پیالہ کو قبول کر لیا۔

یہ تو کچھ پرانی باتیں ہیں، ذرا قریب آیئے، یہ جاپانی اور جرمن قومیں جو زخموں سے چور آپ کے سامنے پڑی ہیں، ان کے رہنماؤں نے ان کے سامنے ایک نصب العین رکھا، وہ اس پر ایمان لائیں اور پھر اس کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہوگئیں، حریفوں نے آگا روکا، انھوں نے نوک شمشیر اس روک کو دور کرنے کی ٹھان لی۔ میدان کارزار گرم ہوگیا، بخت و اتفاق نے جو پانسہ پلٹا تو جیتی ہوئی قومیں پیچھے ہٹنے لگیں، مشکلوں اور تباہیوں کے طوفان نے گھیر لیا، مگر اپنے مطاع مطلق کا جذبۂ اطاعت اور مطمح نظر کا عشق تھا کہ ان کے نوجوان موت کو منہ کھولے ہوئے دیکھتے اور اس میں کود پڑتے، ہوائی جہازوں سے چھلانگ لگاتے اور بم لے کر سیدھے دشمن کے جنگی جہازوں کی چمنیوں میں جا گھستے، بموں سے لدا ہوا پورا جہاز ان بحری جہازوں پر جا گراتے اور اس طرح دنیا کے جنگی لغت میں "خود کش ہوائی جہاز" اور "کفن بردوش طیارے" کے تحیر خیز الفاظ کا اضافہ کر گئے۔ اور اب جبکہ قدرت نے ان کو اپنی آرزوؤں میں ناکام بنا دیا ہے، وہ اس عقیدے کے ساتھ ہراکری کر رہے ہیں کہ مرنے کے بعد دیوتا بن کر اپنی قوم کی خدمت اور اپنے مقصد کی خاطر جنگ کریں گے اور ان کی عورتیں اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش یہ کہہ کر شروع کرتی

ہیں کہ یہ بڑے ہو کر اپنے دشمنوں اور عظمتِ قومی کے غارت گروں سے انتقام لیں گے۔

یہ ان لوگوں کے نظریے اور کارنامے ہیں جن کا کوئی مستقبل نہیں، جن کی قربانیوں کا انجام اپنی زندگی کے لیے خود ان کے اپنے معتقدات کے مطابق معدوم محض ہے اور جن کے سامنے اگر کچھ ہے تو صرف اسی دنیائے دوں کے رذیل مقاصد ہیں۔ کیا ان واقعات اور حقائق میں ہمارے لیے کوئی درسِ عبرت ہے؟ کیا رضائے الٰہی اور سعادتِ ابدی کے حصول میں اتنی گیرائی بھی نہیں جتنی ان حیوانی مقاصد کے حصول میں ہے؟ کیا ایمان باللہ میں اتنی حرارت بھی نہیں جتنی مومنین بالطاغوت کے دلوں میں دیکھی جا رہی ہے؟ کیا حق کی شہادت میں اتنی حمیت بھی نہیں دکھائی جا سکتی جتنی باطل کی شہادت میں آج ظاہر ہو رہی ہے؟ اور کیا فرضِ زندگی کو اتنی اہمیت بھی اہلِ اسلام دینے کو تیار نہیں جتنی یہ کفار دے رہے ہیں؟ انبیائے کرام کے واقعات کو نفسِ حیلہ گر پیغمبرانہ جوشِ تبلیغ اور معجزہ اور تائید روح القدس کا نتیجہ قرار دے کر ٹال سکتا ہے مگر اہلِ کفر و ضلال کی ان سرفروشانہ مساعی کے پیچھے کس معجزہ کا سراغ بتایا جائے گا۔ کاش ہم امکان و عدمِ امکان کی بحثیں شروع کرتے وقت باطل پرستوں ہی کے اعمال و اخلاق پر ایک نظر ڈال لیتے اور انہی سے مقصدِ زندگی کا مفہوم سیکھ لیتے۔ افسوس! یہ منظر بھی کتنا عبرت ناک ہے، وہ جن کی نظر اسی عالمِ آب و گل تک ہے، ادائے فرض میں فکرِ انجام سے اتنے بے نیاز ہوں اور وہ جن کا دعویٰ ہے کہ "ہماری نماز اور ہماری قربانی، ہماری زندگی اور ہماری موت صرف اللہ کے لیے ہے" اندیشۂ ناکامی کی پرستش میں مصروف ہیں۔ جو نقشِ حقیقت ایک اندھا کافر بھی ہاتھوں سے ٹٹول کر معلوم کر لیتا ہے وہ ایمان کی روشنی رکھنے والی آنکھوں کو سجھائی نہیں دیتا۔

یہ عقلیت ہے، جذبات پرستی نہیں اگرچہ بات اپنی جگہ شک سے بالاتر ہے کہ ادائے فرض کے سلسلہ میں امکان کی بحث نہ صرف یہ کہ پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایمان بالقرآن کا مزاجِ لطیف اس کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتا اور نہ صرف یہ کہ یہ طرزِ فکر غیر اسلامی ہے بلکہ کوئی غیور اور باحمیت کافر بھی اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ چیز اس وقت کے مصلحت پرست اور عافیت پسند "عاقلوں" میں اثر نہیں رکھتی۔ عقل و تدبر کے دعوے دار ایک طعن آمیز تبسم کے ساتھ بول اٹھیں گے کہ "یہ سب جذباتی باتیں ہیں جن کا دنیائے فکر و عمل سے کوئی تعلق نہیں"۔ "اہلِ دانش" کے اس ریمارک کو ہم بھی بڑی خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیتے کیونکہ تنازع اور ذمہ داری اٹھانے اور اتنی پرخطر راہ اختیار کرنے کا خواہ مخواہ کسی کو کوئی شوق نہیں ہے مگر دشواری یہ ہے کہ اس سے ہماری مشکل حل نہیں ہوتی بلکہ اس میں مزید گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ پھر جس عقل کی دہائی دی جا رہی ہے، پکار کر کہتی ہے کہ ایسا دین قبول ہی کیوں کیا جائے جو بار بار اور تصریح کے ساتھ اس "جذباتی اصول" کی تعلیم دیتا ہو۔ اگر ایک شخص اس دین کی سچائی تسلیم کرتا اور اس کے اتباع کا عہد کرتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ دہکتے ہوئے الاؤ کے اندر بھی کود پڑنے میں کوئی پس و پیش نہ کرے اگر اس کے دین کا اس سے یہ مطالبہ ہو۔ لیکن اگر اس کی تعلیمات اور اصول اس کی نگاہ میں جذباتی یعنی ناقابلِ عمل اور غیر معقول معلوم ہوتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی صداقت کا قائل ہی نہیں ہے اور نہ اس پر ایمان رکھتا ہے بلکہ اس کا ایمان اپنی عقل و فہم پر ہے اور ایمانداری کا تقاضا یہ ہے کہ اس دین کے نام سے اصول و مسائل پر بحث کرنے سے پہلے وہ اپنی پوزیشن کی تنقیح اور تعیین کرے۔

لیکن کیا واقعتہً یہ بات جذباتی ہی ہے اور اس اصول کی بنیاد نرے جذبات ہی پر ہے؟ نیز کیا جذبات کا ہماری عملی زندگی میں کوئی دخل نہیں؟ ہر بالغ نظر انسان تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اس حقیقت کو پا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کی تعمیر اور رہنمائی سے ان دونوں میں سے کسی چیز کو بھی بے دخل نہیں کیا جا سکتا، یہ البتہ ہے کہ دونوں کے مخصوص اور متعین حدودِ اثر و عمل ہیں اور ایک کو دوسرے کے حلقۂ کار میں لے جانے کا مطلب اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں پھینک دینا ہے۔ کسی مقصد کی تعیین تو خالص عقل ہی کرتی ہے اور وہ شخص بڑا ہی احمق ہوگا جو اپنے مقاصد کی تعیین میں جذبات کو بھی رائے دہی کا مستحق گردانے مگر جب عقل ایک شے کو گہرے سوچ بچار کے بعد مقصد زندگی ٹھیرا دے تو پھر آئے عقل محض کے بس کا یہ کام نہیں کہ وہ اس منزل مقصود کی طرف مطلوبہ رفتار سے قدموں کو بڑھا سکے، اس وقت وہ جذبات کی دست نگر ہوتی ہے اور یہی جذبات دلوں میں وہ آتشیں قوت عمل اور قدموں میں وہ جوش حرکت و اقدام پیدا کرتے ہیں جن کے بغیر منزل تک رسائی ناممکن ہے، یہ جذبات نہ ہوں تو قوئے عمل مست خواب رہتے ہیں اور بڑے سے بڑا مقصد بھی ان کو جھنجھوڑ کر بیدار نہیں کر سکتا۔ عقل صرف سمت سفر مقرر کرتی اور انجن اور پٹری تیار کرتی ہے مگر اس انجن کو حرکت دینے والی اور منزل مقصود کی طرف دوڑانے والی اسٹیم یہی جذبات ہی مہیا کرتے ہیں۔ جذبات نے انسانی زندگی کی تعمیر میں اپنا یہ حق غاصبانہ طور پر نہیں حاصل کیا ہے بلکہ عقل ہی کا عطا کردہ اور تسلیم شدہ ہے۔ یعنی جس طرح مقاصد کی تعیین میں جذبات سے کام نہ لینا عقلیت ہے اسی طرح ان مقاصد کے حصول میں جذبات سے بیش از بیش کام لینا بھی عقلیت ہے، جذباتیت نہیں ہے۔ اس لیے اسلام کو دین حق مان لینا اور اس کے بعد اس کے مطالبات کو پورا کرنے میں نیت و دخل کرنا دانش مندی نہیں بلکہ دانش فروشی ہے، عقل کا نام لے کر عقلیت کو رسوا کرنا ہی نہیں احساس کمتری، دوں ہمتی، بے غیرتی اور ضعف عزم و ایمان کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔

اسلام اور اقامت دین کا تلازم | اس تقریر سے، جو اوپر گزر چکی، صرف اتنا ہی نہیں ثابت ہوتا کہ اقامت دین کی جدوجہد، امکان و عدم امکان کی بحث سے بالاتر ہے اور اس کو طوعاً یا کرہاً ہر وقت، ہر ماحول اور ہر حالت میں جاری رکھنا چاہیے، بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اگر حالات کے اندازے اس جدوجہد کی ناکامی کا یقین دلا دیں، حتیٰ کہ اگر کوئی اپنی آنکھوں نوشتۂ الٰہی میں اس ناکامی کو مقدر دیکھ لے تو بھی اس کو اس "سعی" میں جو اس کے نزدیک لاحاصل ہے، لگے رہے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا کی عام تحریکوں اور اسکیموں کی طرح کی کوئی تحریک اور اسکیم نہیں ہے کہ اگر اس کی کامیابی کے ذرائع مفقود اور امکانات ناپید نظر آئیں تو اس کو ترک یا ملتوی کر دینا جائز اور ممکن ہو سکے نہ مسلمانوں کے سر پر یہ کوئی اوپر سے چپکی ہوئی چیز ہے کہ چاہا تو قبول کر لیا اور جب چاہا اس کو اپنے پروگرام سے خارج کر دیا بلکہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کا لازمی تقاضا ہی یہ ہے کہ اس نے اس دین کی اقامت کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے اور حق سے محبت کرنے کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا کو محبوب ہوں اور جو باتیں حق ہوں، انسان ان کو اپنے گرد و پیش زندہ اور کارفرما دیکھے اور اس کے لیے ہمہ دم کوشاں رہے اور ہر اس چیز کو مٹا دینے کے لیے تیغ بکف نظر آئے جو خدا کو ناپسند اور باطل ہوں، چنانچہ اوپر ہم واضح دلائل کے ساتھ یہ بیان کر چکے ہیں کہ جس طرح آگ اور پانی کا اتحاد ممکن نہیں اسی طرح ایمان اور منکرات میں مصالحت ممکن نہیں۔ پس یہ جد جدا اسلام

سے علیحدہ اور اس پر زائد کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی عین روح اور حرکت قلب ہے۔ اگر کسی جاندار کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ زندہ تو ہو مگر اس کے قلب میں حرکت نہ ہو تو یقین رکھیے کہ کسی انسان کے بارے میں بھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ہو تو وہ مومن مگر اقامت حق کی تڑپ سے اس کے دل و دماغ خالی اور عملی جد و جہد سے اس کے دست و بازو ناآشنا ہوں۔ اس تڑپ اور جد و جہد سے محروم ہو کر یعنی اس مقصد زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے مسلمان کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی سنگ بنیاد ہے جس پر اسلامیت کا قصر تعمیر ہوتا ہے۔ اگر یہ پتھر نیچے سے غائب ہو جائے تو پھر اس قصر کا وجود ہی ممکن نہیں۔ چنانچہ اہل کتاب کے متعلق، جنھوں نے اس مقصد زندگی کو فراموش کر رکھا تھا، قرآن نے صاف صاف کہدیا کہ جب تک تم توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کرو تم کسی اصل پر نہیں ہو اور تمھارا ملی وجود ایک وجود موہوم کے سوا کچھ نہیں۔ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ اس لیے یہ کہنا کہ اس زمانہ میں اقامت دین ناممکن ہے گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان ہونا ممکن نہیں، اور حالات زمانہ کی ناسازگاری کے پیش نظر اقامت دین کی جد و جہد کو ترک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خود اسلام ہی سے دست برداری کی ٹھان لی جائے۔

غلطی افکار کا منبع بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی اور کتنے ہی "ذکی الحس" لوگوں کو تو اس میں خارجیت کی بو محسوس ہونے لگے گی لیکن دراصل یہ استعجاب و استنکار اس غلط ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے کامیابی اور ناکامی کا مفہوم ہی الٹ کر رکھ دیا ہے اور جس کو یہ نہیں معلوم کہ فریضۂ اقامت دین کے معنی کیا ہیں۔ اگر یہ ذہنیت تبدیل کر لی جائے اور اس کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھال لیا جائے تو پھر نہ تو خطرات و مشکلات کا تصور اس کو پریشان کرے گا۔ نہ امکان اور عدم امکان کا سوال پیدا ہوگا۔

ہماری اصل ذمہ داری جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی اقامت ہم پر فرض ہے تو اس کا مطلب بالعموم یہ لیا جاتا ہے کہ زمین پر دین یعنی الٰہی نظام زندگی کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ہمارا فرض ہے، حالانکہ جو چیز ہم پر فرض ہے اور جس کی ہم سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بازپرس ہوگی وہ دین کو قائم کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کو قائم کرنے کی امکانی جد و جہد کرنا ہے۔ اسی طرح کامیابی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری تگ و دو لازماً ایک خالص اسلامی اسٹیٹ قائم کر دینے پر منتج ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے بلکہ درحقیقت یہی ہے کہ ہم اس راہ میں اتنی جانفشانی، قربانی، فدائیت اور سعی و جہد کر دکھائیں جو ہمارے بس میں ہو۔ جس نے یہ کر لیا وہ اپنے مقصد زندگی کو پورا کر گیا اور اپنے مشن میں ہر طرح کامیاب رہا اگرچہ ایک شخص نے بھی اس کی بات نہ مانی ہو اور ایک ذرہ زمین پر بھی وہ دین حق قائم کر دینے میں کامیاب نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا ہے جتنا وہ اٹھا سکتا ہے۔ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اس نے کسی انسان کو ایسی بات کی تکلیف نہیں دی ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں سے زائد ہو۔ مثلاً اس نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو مگر اس کا یہ مطالبہ ہماری فطری استطاعت سے بڑھ کر اور غیر محدود نہیں ہے بلکہ اسی حد تک ہے جتنا انسانی فطرت کے بس میں ہے، چنانچہ فرمایا:-

اِتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (تغابن - ۲) — اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جہاں تک تمھارے بس میں ہے۔

مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اعداءِ دین کا مقابلہ کرنے اور ان کا زور توڑنے کے لیے تیار رہیں مگر ان سے یہ مطالبہ
نہیں کیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے دشمنوں کی قوتِ جنگ کے برابر قوت فراہم کریں بلکہ صرف اتنا کہا گیا ہے اور اتنا ہی ان
پر واجب کیا گیا ہے کہ:۔

أَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ الخ (انفال-۸) — دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی قوت تیار رکھو جتنی تم کر سکتے ہو

ان آیات سے جو اصول ہاتھ آتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری حدودِ استطاعت سے محدود ہے۔
دین کے معاملہ میں بھی حالاتِ زمانہ، مشکلاتِ راہ، ناسازگاری ماحول، قلتِ ذرائع، ان سب چیزوں کا الاؤنس انسان کو ملے گا اور
ان کے لحاظ سے مختلف انسانوں کی کوششوں میں نمایاں تفاوت ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے روبرو
صرف اسی حد تک جوابدہی کرنی پڑے گی جس حد تک اس کو جدوجہد کرنے کی طاقت میسر ہے، اگر ایک شخص کو سامانِ کار
اور سازگاری ماحول نصیب ہے لیکن اس نے اپنی طاقت سے بال برابر بھی کم جدوجہد کی تو یقیناً ادائے فرض کی کوتاہی کا
مجرم قرار پائے گا خواہ ظاہری نتائج کے اعتبار سے اس راہ میں وہ دوسروں سے کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل گیا ہو، بخلاف
اس کے اگر ایک انسان نے اپنی تمام ممکن کوششیں صرف کر ڈالیں لیکن سروسامانِ کار کے ناپید اور حالات کے ناموافق ہونے
کے باعث آخر تک منزلِ مقصود کی طرف منہ کیے ہوئے وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا جہاں سے اس نے اپنی مہم کا آغاز کیا
تھا تو وہ ہر طرح سے اپنے فرض کو ادا کر گیا۔ غرض انسان کو چاہیے کہ جن حالات میں جیسی کچھ قوت بھی حاصل ہوتی جائے
اپنی جدوجہد کا دائرہ اسی لحاظ سے تنگ یا وسیع کرتا رہے۔ اس چیز کو ایک عام مثال سے سمجھیے۔ نماز انسان پر فرض ہے
اس میں قیام اور رکوع و سجود بھی فرض ہیں۔ ایک شخص اگر قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی
نماز نہیں ہوتی، اور اگر کسی واقعی مجبوری کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو اور دو رکعتیں پڑھ چکنے کے بعد ہی اس کی مجبوری
دور ہو جاتی ہو اور اب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر ہو گیا ہو لیکن اس کے باوجود بیٹھا نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہ ہوگی
بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ جیسے ہی اس کو زوالِ عذر اور قدرتِ قیام کا احساس ہو، فوراً کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ بالکل یہی حال
اقامتِ دین کی جدوجہد کا بھی ہے۔ جس شخص کو جس وقت جتنی قوت میسر ہو اس وقت اتنی قوت صرف کرنا اس کے لیے ضروری ہے
اس سے زیادہ کا وہ مکلف نہیں اور نہ اس سے کم ہی اس کی گنجائش ہے۔ زمین پر مکمل طور پر اللہ کے دین کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ایک
آخری غایت (Goal) ہے۔ جہاں تک پہنچنے کی ہر مسلمان کو دعوت دی گئی ہے، مگر وہاں بہرصورت پہنچ جانا واجب نہیں
قرار دیا گیا ہے، جو کچھ واجب ہے وہ یہ کہ اس گول کی طرف اتنے قدم آگے بڑھو جتنے بڑھ سکتے ہو۔

ناکامی ناممکن ہے

جب اقامتِ دین کی فرضیت کا مدعا یہ ہے تو یہ کہنا کتنی بڑی نادانی ہے کہ چونکہ بحالتِ موجودہ کامیابی
کا کوئی امکان نہیں اس لیے ہم اس جدوجہد کو اختیار نہیں کر سکتے۔ جب اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کرنے کی حد ہی
تک ہم مکلف ہیں تو پھر اس راہ میں ناکامی کا کیا سوال ہے۔ دنیا کی تمام تحریکوں اور سرگرمیوں میں کامرانی اور ناکامی
دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی جدوجہد ایسی ہے جس میں ناکامی کا کوئی امکان نہیں تو یہی اقامتِ دین کی جدوجہد
ہے جس میں بدقسمتی سے ہم کو ہر طرف ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے حالانکہ اس راہ میں اگر کوئی ناکامی ہے تو صرف یہی کہ اپنی قوت

کو اس میں خرچ کرنے سے دریغ کیا جائے اور اپنی استطاعت کے مطابق کلمۂ حق کی سربلندی میں سعی نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ کسی ناکامی کا خدشہ نہیں۔ اس راہ کے چلن تمام راہوں سے نیارے ہیں اور معیار کامرانی تمام معیاروں سے جدا ہے۔ مومن اپنی قوتیں میدان سعی وجہد میں ڈال دینے کے بعد جس انجام سے بھی دوچار ہوتا ہے وہ بہرحال فتحمندی و کامرانی ہے، مایوسی و نامرادی کے تو نام سے بھی اس کی جدوجہد آشنا نہیں۔

کامیابی کا اسلامی تصور اس بارے میں جو چیز مسلمانوں کی نگاہوں کا حجاب بن گئی ہے وہ اشیا کی قدریں متعین کرنے کا وہ مادی اصول ہے جو آج ہر چہار سو چھایا ہوا ہے۔ لیکن جس کو قرآن مٹانا چاہتا ہے۔ آج مسلمان کسی چیز کے رد و قبول میں اسی عالم کے منافع و مضار کو سامنے رکھتا ہے اسی لیے اس سعی و کوشش کو لاحاصل اور ناکام سمجھتا ہے جس کا کوئی فوری اور مادی فائدہ ظاہر ہوتا ہوا دکھائی نہ دے۔ لیکن قرآن نجاح اور سعادت کا نشان بالکل مخالف سمت میں بتاتا ہے۔ وہ مسلمان کی امتیازی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دینے والا ہے۔ نیز وہ انسان کی کامیابی یہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی تمام کوششوں کو راہ حق اور تلاش رضائے الٰہی میں لگا دے۔ اب اگر وہ پہلے ہی قدم پر اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو بھی، اور اگر سارے عالم پر دین حق کا جھنڈا گاڑ دے تو بھی، ہر حال میں کامیاب ہے۔

منافقوں کی تمنا بھی تھی اور توقع بھی کہ اب یہ جو روم کے افق سے طوفان جنگ نمودار ہو رہا ہے ان مٹھی بھر مسلمانوں کو، جو تمام دنیا کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں، اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور ان کی یہ ساری شان و شوکت ناکامی و نامرادی کی قبر میں دفن ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کو حکم دیا کہ:-

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ (توبہ - ۷) ان منافقوں سے کہدو کہ تم ہمارے حق میں جس بات کا انتظار کرتے ہو۔ وہ ہمارے لیے دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہی تو ہے۔

دیکھا آپ نے کہ جس طرح مسلمانوں کی فتح بھلائی اور کامیابی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کی شکست کو بھی "احدی الحسنیین" کہہ کر اسی کے برابر کامیابی قرار دے رہا ہے، فتح بھی "حسنیٰ" ہے اور شکست بھی۔ گویا ایک مرد مومن جب جہاد فی سبیل اللہ کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو بہرصورت تمغۂ کامرانی لے کر ہی لوٹتا ہے۔ بے شک یہ کامیابی بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ اپنی تلوار سے دشمنوں کو زیر کر لے اور حق کا بول بالا کر دے مگر اس کے برعکس اگر وہ اور اس کے تمام ساتھی میدان جنگ میں قتل ہو جائیں تو جہاں تک ادائے فرض کا تعلق ہے، یہ بھی اسی کے ہم پلہ ایک کامیابی ہے، قابل صد رشک کامیابی۔ ایسی کامیابی جس پر دنیا کی ساری کامیابیاں اور تمام مفادات قربان ہو جائیں، جس سے بڑی کامیابی کی آرزو ہی نہیں کی جا سکتی۔

یہ ایک جزئی مثال تھی جس کا تعلق مومن کی زندگی کے صرف ایک مخصوص گوشہ سے ہے۔ اسی جز سے کل کی طرف آیئے اور اسی فرع کو اصل بنا کر مومن کی ساری مساعی حیات یعنی مساعیٔ اقامت دین پر پھیلا دیجیے پھر معلوم ہوگا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جن کو دعوت حق دینے کے جرم میں دار پر لٹکا دیا گیا اور جو ایک بالشت زمین پر بھی دین حق قائم نہ کر سکے اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ٹھیک اسی طرح دنیا سے کامران و بامراد تشریف لے گئے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جنھوں نے ایک وسیع خطۂ ارض پر عملاً اللہ کا دین قائم کر دیا تھا۔ مگر اس راز کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے مومن کا دل چاہیے، عقل مصلحت پرست کے اندر یہ "جذباتی" باتیں کہاں سما سکتی ہیں۔

قیامِ دین کے روشن امکانات لیکن "کامیابی" کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے، اس کے لحاظ سے بھی ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج کی دنیا میں اس جد و جہد کی ناکامی کی بہ نسبت کامیابی کا زیادہ امکان ہے، اور اگر اس کو اس کے مزاج کے موافق طریقوں پر پوری سرگرمی سے جاری رکھا گیا جس کی توضیح ہم آگے چل کر کریں گے، تو اس کا بار آور ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح شبِ تار کے بعد آفتابِ عالم تاب کا طلوع۔ اس دعویٰ کے اثبات کے لیے آپ کو عام انسانی فطرت، دنیا کے تمدنی وسائل، تہذیبِ حاضرہ کے پیدا کیے ہوئے حل طلب معاملات اور حق کی ساحرانہ قوت اثر و نفوذ پر ایک گہری نظر ڈالنی چاہیے، اور سب سے اول اور آخر اس چیز پر کہ مسئول و مخاطب کون لوگ ہیں؟

عموماً لوگ کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگاتے وقت پہلے ہی قدم پر یہ ایک عظیم الشان حقیقت فراموش کر جاتے ہیں کہ اس کا مطالبہ کسی گری پڑی جماعت اور بے اصول، خود غرض، دنی الاخلاق اور پست نظر لوگوں سے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جو مومن ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور مومن کی جو ضروری صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں ان کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ "وہ ایک خدا پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں، اس کے سوا کسی کو معبود و مستعان اور صاحبِ حکم و امر نہیں سمجھتے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی مانتے ہیں اور اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں ان کے سوا کسی کو قابلِ اتباع نہیں تسلیم کرتے، وہ نماز، روزے، حج، زکوٰۃ وغیرہ عبادات کے بجا لانے والے ہوتے ہیں، حق کے شائق، سچائی کے مجاہد، معروف کے مبلغ، عدل و قسط کے علمبردار، باطل کے فطری دشمن، منکر کے دائمی محارب، جھوٹ سے متنفر، ظلم سے مجتنب ہوتے ہیں۔ برائی کو نیکی سے اور جہالت کو شرافت سے مٹانا ان کا شیوہ ہے، عدل پر قائم رہنا ان کا شعار ہے اگرچہ اس کی زد خود اپنے ہی اوپر کیوں نہ پڑتی ہو، دشمن کے ساتھ بھی رحم و انصاف کرنے پر مجبور ہیں اگرچہ کتنے ہی مظالم ان کے ہاتھوں جھیل چکے ہوں، ہر حال میں راہِ راست پر قائم رہنے والے ہیں اگرچہ تمام دنیا ہاتھ سے نکلی جاتی ہو۔ پھر دوسروں کی عزت کو اپنی عزت سمجھنے والے اور دوسروں کے مال اور جان کو حرمتِ کعبہ کا مستحق سمجھنے والے ہیں، جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے لیے پسند کرتے ہیں، ان کے ہاتھ اور ان کی زبان سے کسی کو گزند نہیں پہنچتا، خود ننگے اور بھوکے رہ کر غریبوں کو کھلانے پلانے میں فرحت محسوس کرتے ہیں، یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کے لیے ان کے دامن پناہ گاہ ہیں اور ان کی زندگی، ان کی موت، ان کی محبت، ان کی عداوت سب اللہ کے لیے ہوتی ہے۔"

کم و بیش اسی قسم کے اوصاف کے حامل مومن کہلاتے ہیں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جب اقامتِ دین کے امکانات پر غور و فکر کیا جائے تو اس گروہ کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے، اس چیز کو نظر انداز کر کے کبھی صحیح نقطۂ نظر نہیں اختیار کیا جا سکتا۔ اس دور میں بھی جب ایمان و دیانت کا شدید ترین قحط ہے، ایسے لوگ نایاب نہیں ہیں اگرچہ کمیاب ضرور ہیں، اس لیے جہاں تک ایسے لوگوں کے وجود کا تعلق ہے ہم اطمینان رکھ سکتے ہیں۔

اس کے بعد دوسری چیز جو قابلِ توجہ ہے وہ انسان کی فطرت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ باعتبارِ فطرت

انسان خیر پسند ہے، اور ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر ساری نوع انسانی نیکی کی مقناطیسیت سے کھنچ اٹھنے کی صلاحیت رکھتی ہے، خالص باطل پرست اور شر پسند لوگ دنیا میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں، البتہ جب یہی گنتی کے شیاطین انسانی مشینری پر قابض ہو جاتے ہیں اور اہل دنیا کی زمام قیادت ان کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے تو عام لوگ ان کے پیچھے چل پڑنے کی وجہ سے بدی کی نجاستوں میں آلودہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے نور حق ان کے سامنے بے حجاب کر کے چمکا دیا جائے تو فطرت انسانی کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ اس کو قبول کر لے گی اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان اس چیز کو اس کے اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ دیکھنے کے باوجود رد کر دے جو اس کی فطرت کو مطلوب ہے اور اس چیز سے لپٹا رہے جس سے اس کی اصل فطرت ہم آہنگ نہیں۔ پچھلے زمانوں میں ایک تو انسانی عقل اپنی پختگی کو پہنچی نہیں تھی، دوسرے لوگوں میں گروہی اور مذہبی عصبیتیں حد سے زیادہ ہوتی تھیں۔ اور وہ اپنے دلوں کے دروازے ہر صدائے نامانوس کے لیے مضبوطی سے بند رکھتے تھے، تیسرے تبلیغ و اشاعت حق کے ذرائع نہایت محدود تھے۔ ان اسباب کی بنا پر دین حق کی تبلیغ کے نتائج اکثر ناکامی کی شکل میں نمودار ہوتے، مگر اب حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ انسان تحکمی عقائد کی اندھی پیروی سے باغی ہو کر اور اوہام پرستی سے متنفر ہو کر روز بروز حقائق پسندی کی طرف آ رہا ہے، عقلیں ان اصول و نظریات کو چھانٹ کر دور پھینکتی جا رہی ہیں جو انسانی زندگی کے مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مغربی تہذیب اور حریت فکر و رائے نے جہاں دنیا کو بے شمار نقصانات سے دوچار کرا دیا، وہاں ایک ایسی چیز بھی پیدا کر گئی ہے جس سے ایک ایسے دین کو آئندہ چل کر عظیم الشان فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے جو مسائل زندگی کا صحیح، متوازن اور اطمینان بخش حل پیش کر سکے۔ اس تہذیب نے ان اوہام کی بنیاد ڈھا دی ہے جو انسانی دماغ کا پردہ بنے ہوئے تھے، ان اوہام کے ڈھ جانے کے ساتھ ہی ان مذاہب کی چھتیں بھی زمین پر آ رہی ہیں جن کی تعمیر ان اوہام پر ہوئی تھی، اور جو صرف جذباتی عصبیتوں کے حصار میں ہی جی سکتے تھے۔ یہ ایک انقلاب تھا، انقلاب کی فطرت ہمیشہ بحرانی ہوتی ہے، اس لیے یہ انقلاب بھی اپنے جوش میں اوہام کے ساتھ بہت سے حقائق کو بھی بہا لے گیا۔ اور دیگر مذاہب کی طرح خود اسلام کو بھی چیلنج کر گیا جو اپنی فطرت اور عقلیت کی وجہ سے اس کا صحیح رہنما ہو سکتا ہے۔ مگر اس بے اعتدالی کے تلخ نتائج اب اس کے علمبرداروں کے سامنے آ چکے ہیں، اور وہ اعتدال کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اس انقلاب نے ذہنیتوں میں جو بھونچال پیدا کر دیا ہے اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے جاہلانہ مذہبی عصبیتوں کی بندشیں ڈھیلی کر کے بڑی حد تک قبول حق کی راہ صاف کر دی ہے اور ایسے بے شمار افراد پیدا کر دیے ہیں جو کسی ایسی بات کے تسلیم کرنے میں اپنے روایتی معتقدات کو ذرا بھی مانع نہیں سمجھتے جس کی حقانیت ان کے دلوں کو اپیل کر سکے۔ عقل و ذہن کی اس بے تعصبی کے علاوہ تاریخی حقائق بھی کچھ کم قابل اعتنا نہیں ہیں، جب سے نظام عالم کی سیاسی باگ ڈور فاسق و فاجر اور خدا سے باغی ہاتھوں میں آئی ہے اور انھوں نے ہدایت الٰہی کو پس پشت ڈال کر اپنے ذہن و دماغ کے بنائے ہوئے اصولوں پر نظام زندگی کو چلایا ہے اس وقت سے برابر بنی نوع انسان اپنی خودسری کے برے نتائج بھگتتی چلی آ رہی ہے اور انسانی دماغ کے بنائے ہوئے تمام نظام زندگی ایک ایک کر کے ناکام ثابت ہو چکے ہیں، نہ صرف ناکام ثابت ہو چکے ہیں بلکہ ان کی پیدا کی ہوئی پیچیدگیوں اور ان کی نازل کی ہوئی ہلاکتوں سے دنیائے انسانیت چیخ اٹھی ہے اور بڑی بے تابی سے ایک ایسے نظام حیات کی طلبگار ہے جو اس کے دکھوں کا مداوا ہو سکے۔

جب حالات یہ ہیں تو ڈرنے سہمنے اور مایوس ہونے کے بجائے ان لوگوں کو نہایت خوش دلی اور تپاک سے ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو فی الواقع اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ حق صرف اسلام کے پاس ہے، عقل انسانی کو مطمئن کرنے اور مسائل زندگی کو تسلی بخش طریقہ پر حل کرنے کی صلاحیت صرف تعلیمات قرآن میں ہے، اس درد کا درماں صرف دین فطرت میں ہے جس سے آج سارا عالم انسانی تڑپ رہا ہے اور وہ آب زلال صرف سرچشمۂ محمدی میں ہے جو دنیا کی تشنہ کامی کو دور اور اس کے پیاسے جگر کو سیراب کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے ان باتوں کو محض موروثی عقیدت کی وجہ سے مان رکھا ہے ان کے متعلق تو ہم جانتے ہیں کہ وہ ان باتوں پر اسی طرح "داد" دے کر خاموش ہو رہیں گے جس طرح کسی اچھے اور خوش کلام شاعر کو اس کے معتقدین دیا کرتے ہیں، ایسے لوگ دین حق کے قیام سے مایوس ہی ہیں اور رہیں گے اور خدا کا دین بھی ان سے مایوس ہے۔ مگر ان لوگوں کے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں جو دین حق کے ان اوصاف و حقائق پر اپنی عقل اور بصیرت کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں، اور اگر نہیں جانتے تو ان کو جان لینا چاہیے کہ ان حالات میں اگر قرآن کے پیروؤں اور اللہ تعالیٰ سے حق کی شہادت دینے کا عہد و پیمان کرنے والے "مومنوں" نے جن کی تعداد بفضل الٰہی مایوس کن نہیں ہے اپنے فرض کو ٹھیک ٹھیک پہچان لیا اور خلق کے سامنے حق کی اس طرح تبیین کی جیسی کہ کرنی چاہیے یعنی اگر انھوں نے اسلام کے اصول و نظریات کو جدید طرز استدلال اور سائنٹفک دلائل سے مدلل کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا اور قوانین الٰہی کو زمانہ حال کی تعبیروں میں ڈھال کر اور مسائل حاضرہ پر ان کو منطبق کر کے لوگوں پر واضح کر دیا کہ انسانی ضروریات کا صحیح حل اور تمدن عالم کی صحیح رہنمائی صرف الٰہی قوانین کر سکتے ہیں۔ پھر اگر انھوں نے اس کے ساتھ شہادت حق کا عملی نمونہ اس طرح پیش کیا کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اسلام کی راہ راست سے ان کا قدم نہ ہٹا، اگر انھوں نے عبادات اسلامی کو بجا لا کر اپنی سیرتوں کی تعمیر کر لی، اگر وہ انفرادی مسائل اور اجتماعی معاملات دونوں میں اسلامی اخلاق پر پوری استقامت کے ساتھ جمے رہے، اگر انھوں نے قومی، وطنی، نسلی، خاندانی، طبقاتی اور ذاتی مفادات سے آنکھیں بند کر کے صرف اسلام کے مفاد کو اپنے سامنے رکھا، اگر انھوں نے ظلم کا جواب عدل سے، تعدی کا جواب قسط سے، بدی کا جواب نیکی سے، جھوٹ کا جواب سچ سے، مکر و فریب کا جواب وفائے عہد اور حسن معاملت سے، اور انتقام کا جواب رحم و انصاف سے دیا، اگر انھوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی سعی و جہد کا محرک صرف ان اصولوں کی تبلیغ و اقامت ہے جن میں ان کے نزدیک ساری نوع انسانی کی فلاح ہے، اور اگر انھوں نے اس سعی و جہد میں حسب ضرورت عیش و آرام کو خیرباد کہنے اور اپنی آرزوؤں کو پامال کرنے، تباہیاں اور بربادیاں خریدنے اور نقد جان و مال کی قربانیاں دینے میں اتنی ہی استقامت دکھائی جتنی کمیونسٹوں نے کمیونزم کی اقامت میں، جرمنوں نے نازیت کی حمایت و سربلندی میں اور جاپانیوں نے میکاڈو کی رضاجوئی میں دکھائی ہے تو حق کی ساحرانہ قوت تسخیر کا دعویٰ ہے اور خدا کی سنت اس دعویٰ کی گواہ ہے کہ یہ جد و جہد کامیاب ہو کر رہے گی اور دنیا اپنے آپ کو مفتوحیت کے لیے از خود پیش کر دے گی، دل اس کی طرف کھنچ آئیں گے، ذہنوں کے تعصبات کافور ہو جائیں گے۔ اور آنکھیں اس کی طرف فرط عقیدت سے جھک پڑیں گی اور دنیا از سر نو یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کے روح پرور مناظر دیکھ لے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ آج خدا کی پوری زمین پر باطل کی مضبوط گرفت قائم ہے مگر ہم یہ بھی جانتے

ہیں کہ باطل اپنے ابدی اقتدار کا وثیقہ لے کر نہیں آیا ہے، نہ وہ اس زمین کا جائز وارث ہے، قدرت نے زمین کو حق کا مسکن بنایا ہے، جب حق اپنے علمبرداروں کی فرض ناشناسیوں کی وجہ سے اس گھر کو چھوڑ دیتا ہے تو دیو باطل اس خانۂ خالی پر مسلط ہو جاتا ہے مگر جب بھی اس گھر کا اصلی مالک اپنی جگہ لینا چاہتا ہے تو قدرت کے مخفی ہاتھ اس غاصب کو نکال باہر کرتے ہیں، یہ ایک اصول ہے جس کی بنیاد کسی خوش گمانی پر نہیں ہے بلکہ قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ان سنتوں میں سے ایک سنت ہے جن میں کبھی کوئی تغیر نہیں ہوتا، چنانچہ فرمایا:-

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل - ۹) حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اصل یہ ہے کہ باطل مٹنے ہی والی شے ہے۔

پس باطل کی زندگی صرف حق کی غیر موجودگی تک ہے، جب حق آئے گا، آئے گا نہیں بلکہ لانے والے اس کو لائیں گے تو باطل خود جگہ چھوڑ دے گا۔ یہ گمان کرنا خدا پر بہتان لگانا ہے کہ مطلوبہ کوششوں کے باوجود حق کا قیام ممکن نہیں، جو خدا اس باطل کے لیے کی ہوئی قربانیوں کو بھی کامیاب بناتا ہے جو اس کا مبغوض ہے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اس حق کی خاطر کی ہوئی قربانیوں کو رائگاں جانے دے گا جو اس کو محبوب ہے؟ حالانکہ اس نے وعدہ کیا ہے کہ "جو میرے دین کی مدد کرتا ہے میں اس کی مدد کرتا ہوں" اور قرآن نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ خدا کی پارٹی ہزیمت نہیں اٹھاتی، وہ دشمن کے بالمقابل ہوتی ہے تو اس کی غیبی نصرتیں اور مافوق العادہ اعانتیں اس کی پشت پناہ ہوتی ہیں، یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے اس کے پہلو بہ پہلو لڑنے کے لیے اتر آتے ہیں، اور وہ اپنے سے دس گنے دشمنوں پر بھی غالب آکر رہتے ہیں۔ سو یقین رکھنا چاہیے کہ جو فرشتے بدر و اُحد کے میدانوں میں آئے تھے وہ یہاں بھی آسکتے ہیں اور قرآن بتاتا ہے کہ خدا کے بندے اور حق کے مجاہد جب چاہیں ان کو بلا سکتے ہیں۔ چنانچہ جب غزوہ بدر کے موقع پر نزول ملائکہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید خاص اور نصرت غیبی کا اظہار فرمایا تو ساتھ ہی اس شبہہ کو بھی رفع کر دیا کہ یہ نصرت خاص محض وقتی تھی، اور کھول کر بتا دیا کہ "وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ"۔ فتح و نصرت کی زمام اقتدار خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح آج ہے، کل بھی رہے گی، اس لیے کبھی، کسی زمانہ میں بھی، اہل ایمان کو اس تائید و نصرت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یاس و قنوطیت اہل ایمان کے نہیں بلکہ اہل کفر کے خصائص میں سے ہے اور خدا کے ان وعدوں کو، جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، شک اور تردد کی نگاہ سے دیکھنا اس گروہ میں شامل ہونا ہے جس کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ (یہ لوگ خدا کے متعلق خلاف حق اور جاہلانہ گمان کرتے ہیں) ہر مسلمان کو اس گروہ میں شامل ہونے سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ اور اگر قرآن پر واقعی ایمان رکھتا ہے تو اس کو کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے یہ وعدے بھولنے نہ چاہئیں کہ:-

مَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا (طلاق-۱) جو خدا ترسی کی راہ چلتا ہے خدا اس کے ہر معاملہ میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔

مَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے (مشکلات اور نقصانات سے) نجات کی راہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا اور جو کوئی اللہ پر توکل رکھتا ہے اس (کی کل مشکلات) کے لیے اللہ کافی ہے۔

اور سب سے آخر میں یہ کہ:-

اَلَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت) جو لوگ ہماری راہ میں سعی و جہد کرتے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھول دیتے ہیں

ان حقیقتوں کے پیش نظر کسی صاحب فکر کا قیام دین کو ناممکن کہنا قلب و نظر کی بے بصیرتی اور ادائے فرض کی مشکلات سے بزدلانہ فرار کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ بالفرض اگر حالات حاضرہ عدم امکانِ کامیابی کو مستلزم ہیں تو پھر ذرا ان حالات کی نشاندہی کی جائے جن میں کامیابی کا امکان ہو۔ مستقبل کے پردے میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے، اس کا علم تو خدا ہی کو ہے، مگر ماضی کے احوال و مناظر تو قوت حافظہ کی مدد سے پردہ حال پر لائے جا سکتے ہیں، ان احوال کو نگاہِ تعمق سے دیکھیے اور پھر بتایئے کہ تاریخ انسانی کے اس پورے سلسلہ میں جو آدم سے شروع ہو کر آج ختم ہوتا ہے، قیام دین کے لیے جتنی کوششیں کی گئیں کیا ان سب کے زمانے اس جد و جہد کے لیے آج کی بہ نسبت لازماً زیادہ سازگار رہتے ؟ کیا حضرت نوحؑ کا زمانہ، جب کہ ساڑھے نو سو برس تک ان پر گالیوں اور پتھروں کی بارش ہوتی رہی، یا حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ جس میں نمرود کی خدائی قائم تھی، یا حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ، جس میں ہر چہار طرف رومن امپائر کی طاغوتیت چھائی ہوئی تھی، یا حضرت یحییٰؑ کا زمانہ، جبکہ یہودی شیطان ہر صدائے حق کا جواب قتل اور صلیب سے دیا کرتے تھے، یا پیغمبر آخر الزماںؐ کا زمانہ، جبکہ خود مرکز حق تین سو ساٹھ بتوں کا مسکن اور جاہلیت کا دارالسلطنت بنا ہوا تھا؟ یا مجدد الف ثانیؒ کا زمانہ، جب کہ "مسلمان" حکومتِ اسلام کے خلاف اپنا سارا زور صرف کر رہی تھی، یا سید احمد بریلویؒ کا زمانہ جب کہ اہل اسلام کے سینوں پر ایک طرف انگریز اور دوسری طرف سکھ سوار تھے، زمانہ حال کے مقابلہ میں زیادہ سازگار تھے ؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر زمانہ قیام دین کے لیے اس سے کہیں زیادہ پر خطر اور مایوس کن اور ناسازگار تھا، جتنا آج ہے۔ پس اگر مشکلات و موانع کا لحاظ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آغاز آفرینش سے اب تک ایک فیصدی دور بھی ایسے نہیں آئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کوئی دور بھی نہیں آیا جو اس جدوجہد کے لیے سازگار رہا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے سخت زمانوں اور ناساعد حالات میں بھی کتنی ہی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے دنیا جہان کی ناکامیاں اسی زمانہ کے لیے کیوں مقدر مان لی ہیں اور ساری مایوسیوں کو اپنے ہی لیے کیوں مخصوص سمجھ لیا ہے ؟

پھر دوسری بات یہ کہ جب ہم نے ادھر سوا سو سال سے اس مقصد کے لیے کبھی براہ راست تگ و دو کی ہی نہیں تو آخر کس تجربہ کی بنا پر ناممکن ناممکن کا ہنگامہ برپا کیا جا رہا ہے ؟ ہاں اگر ہم نے فکر و عمل کی ساری قوتوں کے ساتھ طریقۂ انبیاء کے مطابق یہ کوشش کرنی ہوتی، اور اس کے بعد بھی ساحل مراد دکھائی نہ دیا ہوتا تو یہ ایک تجربہ ہوتا جو عدم امکان کے دعوے کے حق میں بطور دلیل پیش کیا جا سکتا تھا مگر یہ عجیب ڈھٹائی ہے کہ آپ دریا میں اترتے نہیں اور دور سے کھڑے کھڑے اس کی اتھاہ گہرائی ناپ لینے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ آپ یقین فرمایئے جو ذہنیت آج کے حالات کو ناساعد اور کامیابی کو ناممکن قرار دے رہی ہے وہ قیامت تک امکانات کے حصول میں ناکام رہے گی اور اس ذہنیت کے ماتحت کبھی بھی یہ جد و جہد شروع نہیں کی جا سکتی، جس کفر سے آج وہ لرزاں ہے وہی کل بھی رہے گا خواہ اس کی شکلیں بدلتی رہیں، مگر قیام حق کے لیے ہر کفر کفر ہے وہ اپنے کسی دور اور کسی شکل میں بھی حق کو زندگی کا حق دار سمجھنے کا روادار نہیں ہو سکتا اور نہ ٹھنڈے دل سے اپنے سامنے

اس کو پاؤں جمانے کا موقع دے سکتا ہے۔ جب بھی اقامت حق کے لیے جد و جہد کی جائے گی، کفر اپنے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سامنے آئے گا اور مختلف اشکال میں وہی تمام زحمتیں، رکاوٹیں، مشکلیں اور مصیبتیں استقبال کے لیے موجود ملیں گی جن کا آج تصور کیا جا سکتا ہے۔ بھولنا نہ چاہیے کہ یہ راہ ہمیشہ خارزاروں اور شعلہ زاروں ہی سے ہو کر گذری ہے، اب یا آئندہ جب بھی گذرے گی انہی کانٹوں اور انگاروں میں سے ہو کر گذرے گی۔ وہ امکان اور سازگاری جس کی آپ کو تلاش ہے اس راہ کے سالکوں کو کبھی ملی ہے نہ مل سکتی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ شک و ریب کا کوئی گوشہ باقی نہیں چھوڑا ہے اس نے بتا دیا ہے کہ ایمان کا ہر دعویٰ جانی و مالی آزمائشوں کی بھٹی میں ڈال کر تپایا جاتا ہے اور کوئی دعویٰ عند اللہ اس وقت تک قبول نہیں کیا جاتا جب تک وہ اس بھٹی میں تپنے کے بعد اپنے کو کھرا نہ ثابت کر دے۔ حتیٰ کہ اگر بظاہر ایمان کی راہ صاف اور بے خطر نظر آ رہی ہو تو بھی قدرت اس ابتلا کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے جن میں اس دعویٰ کی صداقت کا امتحان ہو جائے۔

اب یہ منطق ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ جن ابتلاؤں اور ناسازگاریوں کو سنت اللہ ادعائے ایمان کے امتحان کے لیے ضروری قرار دیتی ہے آپ اس کا استقبال کر کے اپنے دعوے کا ثبوت دینے کے بجائے ان سے دور بھاگ رہے ہیں اور انہی کو الٹا اپنے ادائے فرض کو ترک کرنے کے جواز میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ انگریزی فوج کا کوئی سپاہی میدان جنگ کا رخ کرنے سے اس لیے انکار کر دے کہ وہاں سے بندوقوں اور توپوں کے چھوٹنے کی دہشت ناک آوازیں آ رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود وکٹوریہ کراس کا اولین مستحق اپنے ہی کو یقین کرتا ہو، حالانکہ یہ معرکہ ہی وہ آزمائش گاہ ہے جو اس تمغہ شجاعت کا استحقاق عطا کرتی ہے۔

مفاد ملی کا بحث اس سلسلہ میں ہمارے لیے سب سے زیادہ حیران کن جو شے ہے وہ "مفاد ملت" کے نقصانات کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس مسلمان کو

كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (نساء - ۲۰)

قسط پر (بہر حال میں) مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے (حق کی) شہادت دینے والے بنو، اگرچہ اس قسط پر قائم رہنے اور اس شہادت (حق) کی زد خود تمہارے ہی اوپر یا تمہارے والدین یا اقربا ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔

کی تعلیم دی گئی تھی اور جس کے متعلق یہ طے کر دیا گیا ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ - ۱۴)

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔

اب اس کو اس امر کی تلقین کی جا رہی ہے کہ تو حق اور عدل و قسط کی راہ چھوڑ دے اگر اس کے اختیار کرنے میں تیری قوم کا نقصان ہوتا ہو اور خدا کی رضا جوئی کو دور پھینک دے اگر اس سے تیری جان و مال پر آنچ آتی ہو! آخر مفاد ملت کے نام پر اقامت دین کے فرض سے ہاتھ اٹھانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ اب مسلمان کی نگاہ میں مرکزی اہمیت دین اور قیام دین کو نہیں بلکہ اس کے اپنے معاشی و سیاسی مفاد کو حاصل ہو گئی ہے، اب وہ کوئی ایسا طریق کار

نہیں اختیار کرسکتا جس میں کلمۂ حق کی سربلندی اور مطالبات دین کی بجا آوری تو ہو مگر اپنے یا اپنی "قوم" کے مفاد خطرے میں پڑتے ہوں، اس کو چاہیے کہ دین کو دنیا پر، آجلہ کو عاجلہ پر، معاد کو معاش پر، رضائے الٰہی کو مفادِ قومی پر، شہادتِ حق کو مقاصدِ سیاسی پر، اقامتِ دین کو مصالح ملی پر یعنی مقصدِ زندگی کو زندگی پر قربان کردے۔ العیاذ باللہ، یہ ذہنیت ہے آج ہم مسلمانوں کی اور یہ انداز فکر ہے پیروانِ قرآن کا جس پر کفر اور مادیت بھی عش عش کر دے۔ ہم اس نظریہ کے واضعین اور حاملین سے اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کرسکتا ...... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کرسکتے" (حضرت مسیح)

اس نظریہ کے ساتھ خدا پرستی کا جوڑ کبھی نہیں لگ سکتا۔ جس مفادِ قومی کا آپ شور مچا رہے ہیں۔ وہ ایک خطرناک بت ہے جس کو توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جاسکتا۔

زمانۂ نبوت میں منافقین کا نقطۂ نظر یہی تھا اور ان کے نفاق کی بنیاد اس چیز پر تھی کہ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآىِٕرَةٌ ہم کو ڈر ہے کہ اگر ہم بالکل کھلا اور یکسو ہو کر اسلامی جماعت میں شامل ہوگئے تو ہم کو مصیبتیں گھیر لیں گی اور اسلام کی وجہ سے ہم سارے جہان کی عداوت کا نشانہ بنیں گے۔ اسی طرح بہت سے کافروں کا بھی کہنا یہ تھا کہ محمدؐ تمہاری باتوں کی صحت و صداقت کا ہم انکار نہیں کرتے مگر۔

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (قصص - ۶) اگر ہم آپ کے ساتھ ہوکر ہدایت الٰہی کی پیروی کرلیں تو فوراً اپنی مادرِ وطن سے مار کر نکال باہر کردیے جائیں گے۔

یہ دونوں گروہ اتباعِ حق کے بارے میں جس طرزِ فکر و استدلال سے کام لے رہے تھے کیا وہی طرزِ فکر و استدلال آج بھی مفادِ قومی کے نعروں کے نیچے کام نہیں کر رہا ہے؟ قرآن سراپا حق ہے، پیغمبر صادق و مصدق ہے، اتباعِ اسلام ہی ذریعۂ نجاح و فلاح ہے، لیکن اگر قرآن کے مطالبے، رسول کے فرمان اور اسلام کے اصول و مقتضیات پر عمل ہوا تو ہم برباد ہوجائیں گے، ہم کو اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ زمانہ بھر کی آفات و بلیات ہم پر ٹوٹ پڑیں گی، ذرہ ذرہ ہماری مخالفت پر کمر باندھ لے گا، اپنی "مادرِ وطن" کو انگریزی ہی کے قبضہ میں رہنے دینگے یا برادرانِ وطن کے اقتدار میں دے دیں گے اور ہم خود غلام اور اچھوت، مفلس و پسماندہ اور خدا جانے کیا کیا ہوجائیں گے! کاش مسلمان اپنے خلاف اللہ تعالیٰ کو ایسی کھلی ہوئی حجتیں دینے سے قبل ذرا سوچ لیتے کہ ہم اپنی زبانوں سے کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو مفادِ قومی کا بچانا نہیں ہے بلکہ اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

پھیر کے راستے

اب رہا یہ سوال کہ آیا ہم اس نصب العین کے لیے براہِ راست جد و جہد کرنے کے بجائے کوئی پھیر کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ سو اس کے متعلق تجربہ اور عقل دونوں کا متفق فیصلہ ہے کہ یہ طرزِ عمل سراسر غلط اور ناکام ہے۔ اور حق کی فطرت بھی اس سے ابا کرتی ہے۔ اب تک کی تاریخ یہی بتلاتی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اس مقصد کو اپنا مقصدِ زندگی قرار دیا ہے ان میں سے کسی نے بھی یہ پالیسی اختیار نہیں کی۔ متمدن یا غیر متمدن، آزاد یا غلام، دولت مند یا مفلس غرض جس قسم کی قوم کے اندر بھی کوئی داعیِ حق اور علم بردارِ قیامِ دین آیا اس نے سب سے پہلی آواز جو منہ سے نکالی وہ یہی اور صرف یہی تھی کہ "اے بندگانِ خدا! خدا کی بندگی اور طاغوت سے اجتناب اختیار کرو"۔ ہم تفحص کے باوجود کسی نبی کو اس پالیسی سے ہٹ کر کوئی دوسری پھیر والی پالیسی اختیار کرتے ہوئے نہیں پاتے۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ ابھی اس سوال کو چھوڑ دیجیے، پہلے اس حقیقت کو پوری جستجو اور تنقید کے ساتھ پرکھ لیجیے کہ ایسا ہی ہوا یا نہیں؟ اگر ایسا ہوا

اور یقیناً ہوا، تو پھر ان لوگوں کے لیے جو اسوۂ انبیاء ہی کو اپنا مرجع کل ماننے کے مدعی ہیں، اس طریق کار کو ترک کرنا جائز کسی حجت شرعی کی بنا پر ہو سکتا ہے؟ اگر حالات زمانہ کے اختلافات کوئی چیز ہیں تو کیا اس بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ تمام انبیاء کے زمانہائے بعثت تو بالکل یکساں نوعیت کے تھے، جس کی وجہ سے ان سب کے طرز عمل میں اتنی کامل یکسانی اور مماثلت پائی جاتی ہے؟ اور یہی بیسویں صدی کا ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی زمانہ ہے جس کے حالات یکایک اب تک کی پوری تاریخ انسانی کے حالات سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا دعویٰ کوئی بھی عاقل نہیں کر سکتا اور سب جانتے ہیں کہ کچھ غیر متغیر حقائق تو ایسے ہیں جو تمام زمانوں میں مشترک رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے مگر عوارض و ظواہر اور احوال و ظروف ہر دور کے الگ الگ ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ اس لیے اگر ان ظاہری خصوصیات کا لحاظ کیا جائے تو جس طرح آج کا زمانہ پہلی صدی ہجری سے مختلف ہے۔ اسی طرح پہلی صدی ہجری کا زمانہ دور عیسوی سے اور دور عیسوی دور موسوی سے بھی مختلف تھا، اس لیے اگر اختلاف احوال کے باوجود تمام انبیاء نے متفقہ طور پر ہمیشہ براہ راست جدوجہد کی پالیسی اختیار کی تو اس اختلاف کے باوجود بھی، جو ہمارے زمانہ اور پچھلے زمانوں میں بظاہر نظر آتا ہے، ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ یہی پالیسی اختیار کریں۔ کیونکہ اس کام کے لیے کوئی دوسرا طریقہ کبھی آزمایا ہی نہیں گیا۔ اور تمام انبیاء کا اسی طریق کار کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس جدوجہد کا مزاج ہی اسی قسم کا ہے کہ اس کے لیے براہ راست اقدام کیا جائے۔ یہ دلیل یقین سے بڑھ کر ہم کو حق الیقین اور عین الیقین کی حد تک پہنچا دے سکتی ہے اگر ہم اس چیز کو سامنے رکھ لیں کہ بعض انبیاء کو پھر کی پالیسی اختیار کرنے کے بہتر سے بہتر مواقع ہاتھ آئے مگر انھوں نے پوری صفائی کے ساتھ ان کو ٹھکرا دیا۔ سید الانبیاء صلعم کے سامنے قریش نے پیش کش کی کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں اور اس کے لیے ہم آپ سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتے کہ آپ اپنی "دعوت توحید" سے دست کش ہو جائیں، آپ سے ہماری صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ ہمارے بتوں کو برا کہنے اور ہمارے جذبات کو ٹھیس لگانے سے باز رہیں۔ غور فرمائیے کہ آج کے اہل سیاست و تدبر کے نقطۂ نظر سے یہ کتنا اچھا اور مغتنم موقع تھا کہ رسول اللہ اس پیشکش کو قبول فرما کر ایک طرف تو ان مصیبتوں اور فتنوں کا خاتمہ کر لیتے جو ان کی اور ان کے پیرووں کی زندگی اجیرن کیے ہوئے تھے، دوسری طرف تخت حجاز پر قابض ہو کر حکمت و تدبر اور مصلحت شناسی کے ساتھ اپنے حاکمانہ اثر و اقتدار سے کام لیتے ہوئے تدریجاً اپنی منزل مقصود کی طرف مارچ کرتے اور رفتہ رفتہ دین حق کی حکومت حجاز و عرب پر قائم کر دیتے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ پیغمبر عالم نے اس "مغتنم" موقع پر کیا طرز عمل اختیار کیا اور اس پیش کش کا کیا جواب دیا؟ یہ کہ "خدا کی قسم اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیے جائیں تو بھی میں اپنی دعوت حق اور اپنے طریق کار سے باز نہ آؤں گا۔" یہ کسی پرجوش اور ماؤف الدماغ انقلابی نوجوان کے الفاظ نہ تھے بلکہ اس معلم حکمت اور راز دان حقیقت کے الفاظ تھے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ اس کے دل اور زبان پر براہ راست خدا کی نگرانی قائم تھی اور جس نے کبھی کوئی بات جذبات کے ہیجان میں نہیں کہی۔ اس لیے ایک مومن کا ذہن تو اس وہم کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دے گا کہ آنحضرتؐ نے اس موقع اور اس طریق کار کے ہاتھ آتے ہوئے بھی عمداً ان کو ترک کر دیا جو حصول مقصد کے لیے براہ راست جدوجہد سے زیادہ موزوں اور کارگر تھے۔ یا یہ کہ ان میں، نعوذ باللہ، دور حاضر کے مدبروں اتنی بھی انجام بینی نہ تھی اور نہ یہ صلاحیت تھی کہ "احوال و ظروف زمانہ" کے مطالبات و مقتضیات کا اندازہ کر سکتے اور وقت و ماحول کی مصلحت سے اس پالیسی کو قبول کر لیتے۔

اب ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انبیائے کرام کے اس اسوے اور متفقہ طریق کار کے ہوتے ہوئے ہم کو کس اسوہ اور راہ عمل کی ضرورت ہے۔ نظری حیثیت سے بھی دیکھیے تو اس طرز فکر اور اس نظریہ میں بے بنیاد وہموں اور طفلانہ خوش گمانیوں اور خود فریبیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھیر کے راستے اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حق کو باطل نما بنا کر پیش کیا جائے اور جس باطل میں آپ پڑے ہوئے ہیں اس سے نکل کر حق کی طرف بھاگنے کے بجائے ایک دوسرے باطل کے سایہ میں جا کھڑے ہوں کیونکہ اگر آپ موجودہ باطل ماحول کو درہم کر کے ایک ایسا ماحول قائم کریں جو حق نہ ہو تو لازماً باطل ہی ہوگا۔ جس کا رنگ و روغن تو نیا ہوگا مگر فطرت بہرحال وہی ہوگی جو موجودہ باطل کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم اس پر اثر ڈال کر اپنے نصب العین کے لیے زیادہ سازگار بنائیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ دنیائے عمل میں اس خام خیالی کی کوئی قیمت نہیں، باطل کبھی حق کا سازگار نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں حق کے جو پیوند آپ بہزار دقت لگائیں گے وہ آپکے مقصد کے لیے خالص باطل اجزاء سے زیادہ ہی مضر ثابت ہوں گے۔ دور نہ جائیے اسی ہندوستان میں بہت سی "اسلامی ریاستیں" قائم ہیں جن میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کا آپ آئندہ نظام ملکی میں جوڑ لگانا چاہتے ہیں، مگر وہاں اقامت دین کا نام ہی لے کر دیکھیے، جیل کا دروازہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائیں گے۔ آپ اپنی اس جدوجہد میں غیر ملکی حکومت ہی کو سدراہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر آپ شاید بھولتے ہیں کہ حضرت مسیح کے مشن کے متعلق رومی اقتدار ابھی خاموش ہی تھا کہ ان کی اپنی ہی قوم یا یوں کہیے کہ اس وقت کے "مسلمانوں" ہی نے بڑھ کر اس مشن کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر اپنی حال ہی کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ شیخ عبدالوہاب نجدی کی تحریک کا متعلقہ "اسلامی" حکومتوں نے کس تپاک سے استقبال کیا، شیخ جمال الدین افغانی نے ایک جزئی دینی تحریک کا نام لیا اور آپ کی انہی موجودہ اسلامی حکومتوں نے انکو رہنے کے لیے جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ اور اگر آج بھی کسی کو ہمت ہو تو ان ممالک میں جا کے یہ آواز اٹھا کر قدر عافیت معلوم کر سکتا ہے۔

درحقیقت یہ دفع الوقتی کی باتیں ہیں اور یہ نظریہ اسی ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے قرآن کے احکام و مطالبات کی "ناسازگاریوں" سے گھبرا کر مطالبہ کیا تھا کہ "اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اسی میں کچھ ایسی ترمیمیں کر دیجیے جو زمانہ اور ماحول سے ہم آہنگی پیدا کر سکیں"۔ اس طرز پر سوچنے والوں کی نگاہ شاید اس طرف نہیں جاتی کہ دنیا کے جو ہنگامے آج ہیں، کل بھی رہیں گے اور جو مصالح اور مشکلات آج ان کا راستہ روک رہی ہیں، آئندہ بھی ان میں کوئی کمی رونما نہ ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ پھیر کی راہ اختیار کرنے کے اسباب و محرکات نہ کبھی ختم ہوں اور نہ اقامت دین کے لیے کبھی براہ راست جدوجہد کی جائے۔

(باقی آئندہ)

قانونِ بقائے انفع

اجتماعیات میں تحفظِ حق و عدل کا فطری اہتمام

(از جناب نسیم صاحب صدیقی)

(۳)

بحث کے مبادیات طے ہو چکے ہیں اور اب ہمیں جماعتوں کی "حیاتیات" (Biology) کے بڑے بڑے اصولوں کی ایک جھلک دیکھ لینی چاہیے تاکہ ہمارے دعویٰ کی تصدیق یا تردید ہو جائے۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ جماعتوں کا ظہور کیونکر ہوتا ہے وہ ارتقا کیسے کرتی ہیں، اقتدارِ سیاسی سے کیسے کام لیتی ہیں اور ان کا خاتمہ کیونکر ہوتا ہے تو ان معلومات سے وہ اصول اخذ ہو سکتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ طے کر سکیں کہ "خدمت" ان کے لیے وجہ قوت ہے یا ظلم؟

جماعتوں کا ظہور جماعتوں کا ظہور اس طرح نہیں ہوتا جیسے ایک مقررہ وقت گذرنے کے بعد کسی خاص فصل کے اگنے کا موسم آجاتا ہے اور ہمیشہ آتا رہتا ہے۔ جماعتوں کی پیدائش اصولِ تناسل پر بھی نہیں ہوتی کہ ایک جماعت سے دو اور دو سے چار بنتی چلی جا رہی ہوں، چاہے ان کی کوئی ضرورت ہو یا نہ ہو —— جماعت ایک اخلاقی ضرورت پورا کرنے کے لیے وجود میں آتی ہے، بلکہ وجود میں لائی جاتی ہے۔ کسی بھی جماعت کی علتِ ظہور دریافت کرنے کے لیے تاریخ سے سوال کیجیے، وہ آپ کو ایک ہی جواب دے گی کہ ہر جماعت کا ظہور خاص اس وقت ہوا ہے جب کسی انسانی آبادی میں نظامِ رواں کے باطل پر مؤسس ہونے اور ظلم پر کار فرما ہونے کا احساس پھیل نکلا ہے۔ بقول چارلس ڈاونز ہیرن:-

"ہر برائی خود اپنے ازالہ کا مطالبہ کرتی ہے"۔

مرض خود مریض کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے نجات دلائے۔ اسی طرح جب بھی کوئی نظام اپنے زیر اثر حلقہ میں کچھ لوگوں کو دبا کچل کر رکھتا ہے تو قانونِ فطرت کے دباؤ سے وہی لوگ اسے ختم کرنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً قرآن فرعون کے دور کے متعلق کہتا ہے کہ "فرعون زمین میں سرکش ہو رہا تھا اور اس نے ملک کے لوگوں کو طبقوں میں بانٹ رکھا تھا تاکہ وہ ایک گروہ کو کمزور کر رکھے اور اس غرض کے لیے وہ اس کے بیٹوں کو قتل کرا دیتا تھا اور اس کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا یقیناً وہ مفسد تھا۔ پس ہم نے چاہا کہ مستضعفین یعنی مظلوموں پر احسان کریں اور انھیں ملک کی سرداری اور وراثت عطا کریں اور ان کے قدم جما دیں (نمکن فی الارض بخشیں) اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ انجام دکھا دیں جس سے وہ خوف کھاتے تھے"۔ اس ارشاد میں فطرت کا جو محکم قانون بیان ہوا ہے عین وہی اس وقت ہمارے مدنظر ہے۔ یعنی

جب کسی گروہ کا اقتدار کسی انسانی عنصر پر ظلم ڈھاتا ہے تو نظامِ فطرت اسی مظلوم عنصر کو اس کی سرکوبی کے لیے کھڑا کر دیتا ہے۔ اس طرح[1] برائی خود اپنے ازالہ کا سامان کرتی ہے۔

پس جس اقتدار نے اپنے نظام کی اساس غلط نظریات پر رکھی ہو اور انسانی فطرت کے مختلف تقاضوں کو عادلانہ طریقے سے پورا کرنے کے لیے مناسب ضابطۂ حیات مہیا نہ کیا ہو، اس کے زیرِ اثر جو آبادی بس رہی ہے، دھیرے دھیرے اس پر زندگی تلخ ہونے لگتی ہے، غلط نظریات اور غلط قوانین پر کاربند رہنے کے نتائج ابھرنے لگتے ہیں اور اس وقت لوگ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ زندگی کی تنظیم میں کچھ "غلط" کیا گیا ہے۔ یہ احساس تحفظِ حق و عدل کے فطری قانون کے ماتحت ہی رونما ہوتا ہے اور یہ جب عام ہو چکتا ہے تو تغیر کی خواہش ابھر آتی ہے اور یہ وقت ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی "پس چہ باید کرد" کی صدا لگانے لگتی ہے۔

اس آواز کے جواب میں اجتماعی فکر کی کھیتی اپنا سب کچھ باہر اگل دیتی ہے اور مفکرینِ وقت اپنی بساط کے مطابق یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ نظامِ رواں کی اساس میں فلاں فلاں موقع پر حق کی جگہ باطل کا دخل ہو گیا ہے اور فلاں فلاں رخنوں سے ظلم گھس آیا ہے اور اب ظلم و باطل کا سدِ باب کرنے کے لیے ان ان فکری و عملی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

یہ موقع کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ادھر تو انسانیت کے اجتماعی دکھوں کے معالجے کے لیے دیانتدار اور اہلِ حکمت اطبا اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں اور ادھر پیٹ کے بندے "عطائی" اپنے تھیلے اور صندوقچے اٹھائے آموجود ہوتے ہیں اور پھر ان مختلف قسم کے معالجین کا گروہ نظمِ اجتماعی کی "بیماری" کی مختلف توجیہیں کرتا ہے کہ مریض نے فلاں فلاں بے احتیاطیاں کیں، غذا میں فلاں فلاں مضر عناصر شامل ہو گئے تھے، فلاں فلاں اعضا پر مختلف وجوہ سے زیادہ بار پڑا ہے اور اب علاج کے تقاضے یہ ہیں۔

اس طرح نظری اور عملی تغیرات کی متعدد دعوتیں نمودار ہو جاتی ہیں، ان کے علمبرداروں میں خدمت پیشہ مخلصین بھی موجود ہوتے ہیں اور انتفاع پیشہ بکار بھی۔ اور پبلک بہرحال ادھر کھنچتی ہے جدھر اسے حق و عدل کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے، "ہوتا ہے" کی بات نہیں کی جا رہی ہے بلکہ "نظر آتا ہے" کے الفاظ استعمال کئے جا رہے ہیں۔ پھر اگرچہ ابتداءً متعدد گروہ نشوونما پانے لگتے ہیں مگر لوگوں کو جن کے پاس حق و عدل کی متاع نسبتاً زیادہ نظر آتی ہے وہ دوسروں کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور آخر کار غلبہ اسی ایک جماعت کے لیے ہوتا ہے جو "انفع" یا[2] "انفع نما" ہو۔

آپ چھوٹے پیمانہ پر مختلف ممالک کے پارلیمنٹری انتخابات کی تاریخ پر نظر ڈالیے، کتنی ہی مختلف طاقتیں میدان میں

---

[1] یہ ایک الگ بات ہے کہ نظری اور عملی دونوں پہلوؤں سے انسان میں ایسی بڑی بڑی کمزوریاں موجود ہیں جن کے زیرِ اثر وہ مروجہ نظریاتِ باطل سے بغاوت کرنے کے لیے دوسرے نظریاتِ باطل کا مومن بن جاتا ہے یا غلط لا زمی عملی نظام کو توڑنے کے بعد خود جو نظام بناتا ہے اس میں بھی ظلم ایک نئے روپ میں آگھستا ہے لیکن اتنی بات قطعی ہے کہ انسان کی طبیعت باطل اور ظلم کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔ [2] یہ ضروری نہیں کہ کسی سو فیصدی باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے سو فیصدی حق کی متاع کسی جماعت کے پاس ہو، نہیں دس فیصدی حق بھی صفر فیصدی حق کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اب جس جگہ دس فیصدی اور پندرہ فیصدی اور تیس فیصدی حق کے کر جماعتیں اٹھیں وہاں تیس فیصدی حق والی آگے آجائے گی اور وہی انفع یا "انفع نما" شمار ہو گی۔ اس کے انفع یا انفع نما ہونے کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ اس کی متاع سو فیصدی حق و عدل کی متاع ہے۔

اتری ہیں مگر جھٹ سے آگے وہی جماعت آتی ہے جو ملک کی آبادی کے لیے انفع یا نفع نما ہو۔ یعنی فی الواقع اس سے زیادہ سے زیادہ خدمت کی توقع کی جاسکے، یا وہ اپنے زیادہ سے زیادہ خادم ہونے کا یقین عوام کو دلانے میں کامیاب ہو سکے لیکن بعد میں جب اس کی فریب کاری کی قلعی کھل جاتی ہے تو وہ اٹھا کر الگ پھینک دی جاتی ہے اور ایک نئی طاقت آگے ہو جاتی ہے۔

بہر حال "ظہور جماعت" کی لازمی علت ظلم و باطل کے نتائج و اثرات سے بچنے کی نیم شعوری خواہش ہے جو انسان کی اجتماعی نفسیات کا ایک فطری عمل ہے۔ یہ عمل اس بات پر گواہ ہے کہ انسانیت ظلم و باطل سے حق و عدل کی طرف حرکت کرنے پر مجبور ہے۔ اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو کوئی نمایاں مثال تاریخ سے ایسی نکال کر دکھایئے کہ کسی سیاسی جماعت کا ظہور اس حال میں ہوا ہو کہ نظام رواں سراسر حق و عدل کا نظام ہو اور اس کے زیر سایہ بنی آدم کی زندگی امن و مسرت کے ساتھ گزر رہی ہو۔ یا یہ کہ کسی جماعت نے اپنے وجود کا ناگزیر ہونا اس استدلال سے ثابت کیا ہو کہ چونکہ نظام رواں تمام تر حق و عدل کا مجموعہ ہے اور اس کے سایہ میں انسان امن و مسرت سے بہرہ ور ہو رہا ہے اس لیے مجھے اس کو بدلنا ہے اور اس غرض کے لیے قوت و تمکن کو ایک نقطہ پر مرتکز کرنا ہے۔ یقیناً ایسی کوئی مثال تاریخ کی مدد سے کسی قیمت پر بھی نہ مل سکے گی! — پھر فرمایئے، کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جماعتوں کا وجود ہوتا ہی ظلم اور باطل کے قلع قمع اور حق و عدل کے قیام کے لیے ہے۔ اور اسی کا وہ دعویٰ رکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہم "جماعت" کو ایک اخلاقی وجود قرار دیتے ہیں جو ایک فطری غرض کو پورا کرنے کے لیے انسانی ارادہ کے ماتحت نمودار ہوتا ہے۔

جماعتوں کی دعوت | جماعتوں کی دعوت کی فطرت کیا ہے؟ حمایتِ حق و عدل، یا اعانتِ ظلم و باطل؟ — جیسا کہ ابھی گذشتہ سطور میں ہم عرض کر چکے ہیں، ہر جماعت زندہ رہنے اور پھیلنے اور قوت پانے کے لیے اپنی اخلاقی حیثیت کو قوی بنانے پر مجبور ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ نظام رواں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو جن کے نیچے مظلوم پڑے کراہ رہے ہیں، ایک ایک کر کے نمایاں کرے اور صاف اور سادہ تنقید سے یہ ثابت کر دے کہ اس کی تشخیص بالکل صحیح ہے، پھر جن غلط نظریات اور ظالمانہ ضوابط کی وہ نشاندہی کرے ان کی جگہ لینے والے صحیح نظریات اور عادلانہ ضوابط کا ایک نیا مجموعہ اس انداز میں پیش کرے کہ لوگ اس مجموعہ کے عناصر کے کھرے پن پر مطمئن ہو جائیں یعنی اثباتی نظریات کے حق ہونے اور تعمیری ضوابط کے منصفانہ اور مطابق فطرت ہونے کو تسلیم کر لیں۔ فلسفہ اور علم النفس اور سیاست اور معیشت اور سائنس سارے علوم ان کی تائید کرنے والے ہوں۔ صرف یہ راستہ ہے جماعتوں کے فروغ پانے کا اور صرف یہی راستہ ہے جسے ہر جماعت نے اختیار کیا ہے۔ دعوت کا تنقیدی و تخریبی پہلو "جو کچھ ہے" کے مظالم و مفاسد کا تعین کرتا ہے اور لوگوں کو اس سے شعوری نفرت دلاتا ہے اور اس کا اثباتی و تعمیری پہلو "جو کچھ ہونا چاہیے" کی صحت و درستی کا یقین دلاتا ہے اور لوگوں کو اس کے لیے قربانیاں کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ "ہے" کی صحت و درستی ثابت کر کے اور "چاہیے" کی کوتاہی اور نادرستی کا یقین دلا کر کوئی جماعت ابھر سکے۔ نہ ایسی دعوتیں کبھی ابھری ہیں اور نہ کبھی انہیں مقبولیت حاصل ہو سکی ہے۔

یہ واضح رہے کہ "خدمت پیشہ" اور "انتفاع پیشہ" یا "انفع" اور "انفع نما" جماعتوں کے طریقِ دعوت میں ایک نازک سا فرق ہوتا ہے جسے محسوس نہ کر سکنے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ عوام دھوکا کھا جاتے ہیں بلکہ بہت سے خواص بھی اس معاملہ میں "عوام" ثابت ہوتے ہیں۔ عملی سیاست کی دنیا ہی میں نہیں، بلکہ جماعتوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے "محققین" تک اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پھسل جاتے ہیں۔

"انفع" جماعتیں چونکہ اس متاع کی سرمایہ دار ہوتی ہیں جس کی اصلاً اجتماعی ذہن میں قدر ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنے آپ کو بالکل سادگی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے نظریات منطقی، پیچ پیچ سے خالی اور عقل عامہ کو مطمئن کر سکنے والے ہوتے ہیں، اور ان کی عملی کارروائیاں ریاکاری سے ملوث نہیں ہوتیں اور سلیم الفطرت فرزندانِ آدم رفتہ رفتہ ان کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ لیکن انتفاع پیشہ یعنی "انفع نما" جماعتوں کا طریقِ دعوت سادہ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ایک ایسی متاع فکر لے کر کھڑی ہوتی ہیں جو اصلاً مقبولِ انسانیت نہیں ہے۔ وہ مجبور ہوتی ہیں کہ اپنے اصلی فلسفہ اور پروگرام پر نمائشی حرکات اور فریب کارانہ پروپیگنڈے کا ایک ایسا رنگین و نقشیں خول چڑھائے رکھیں جو عوام کی "نظر بندی" اس حد تک کر سکے کہ دام آنکھوں کے سامنے بچھا ہو مگر نظر نہ آئے۔ ان جماعتوں کو بے انصافی اور ظلم کے اثبات، یعنی فطرتِ انسانی کے انفرادی، اجتماعی اور نوعی مطالبات کو پورا کرنے میں عدمِ توازن اور عدمِ توافق کو برحق دکھانے کے لیے کائنات، زندگی، انسان، اخلاق، تمدن، سیاست، معیشت اور معاشرت کے صحیح اساسی نظریات سے انحراف ناگزیر ہوتا ہے، اس لیے انھیں دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لیے نہایت پیچیدہ اور پُراسرار فلسفے تراشنے پڑتے ہیں۔ یہ فلسفے اور استدلال اگرچہ گرہوں کو کھولنے کی جگہ زدلیدہ تر کرتے جاتے ہیں اور ان میں انسان کو مطمئن کرنے کی اہلیت ہرگز نہیں ہوتی، مگر رنگین عبارت آرائیاں، چلتے ہوئے چست فقرات اور مرعوب کن اصطلاحات جو ان میں استعمال کی جاتی ہیں، وہ ایسی تیرِ بہدف ثابت ہوتی ہیں کہ دنیا مفتوح ہو کے رہ جاتی ہے ـــ اس بری طرح مفتوح ہوتی ہے کہ تاریخ شاید دل ہی دل میں اس کی حماقت پر ہنستے رہ جاتے ہیں کہ یہ انسانوں کا گلہ بھی کیسا سادہ لوح ہے کہ "زہر" کے بجائے "گُڑ" سے مرا جا رہا ہے۔ لیکن انسانوں کا گلہ کرے بھی کیا کہ اس پر حملہ آور چاروں طرف سے یک بارگی حملہ کر دیتے ہیں، کوئی اپنا پیغام فلسفوں کی شکل میں، کوئی سیاسی پروگرام کی شکل میں، کوئی ادبِ لطیف کی شکل میں، کوئی منظومات کی شکل میں، سنائے چلا جا رہا ہے اور سننے والوں کو سوچنے کا موقع نہیں دیتا۔ پھر اسٹیج سے، پریس سے، سینما سے، ریڈیو سے، غرض ہر مورچہ سے تباہ کن حملے ہونے لگتے ہیں۔ آخر لوگ شکست مانتے ہیں اور رفتہ رفتہ ایک "انفع نما" جماعت تمکن کے تخت پر ظلم کی تلوار برہنہ کر کے جا بیٹھتی ہے۔

ادھر عملی سیاست کے میدان میں ایسی جماعتوں کے کارنامے کیا ہوتے ہیں؟ جلسے، جلوس، فوجی مارچنگ، بینڈ، باجے، جھنڈے، وردیاں، اعلان، بیان، تجاویز، ریزولیوشن وغیرہ کا ایک سیلاب امڈنے لگتا ہے اور اس قسم کا سیاسی مداری پن جب شہر شہر اور قریہ قریہ میں پھیل جاتا ہے تو ملک سمجھتا ہے کہ سبحان اللہ کتنی کارگر اور فعال جماعت ہے اور کس سرگرمی سے تنظیم کر رہی ہے اور بس پھر بے بس ہو کر لوگ اسی طرح اژدہام کر کے ان تنظیموں میں جذب ہونے

لگتے ہیں جس طرح کسی سرکس اور تھیٹر کے اندر لوگوں کا داخلہ ہوتا ہے۔ اب ان تنظیموں کا قدم جتنا جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے "نمائش کاری" اتنی ہی زیادہ چمک دمک کے ساتھ جاری ہو جاتی ہے۔ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد تو ان میں پوری طرح آنکھیں چندھیا دینے والی براقی نمودار ہو جاتی ہے، جیسا کہ "اندھا شاہی نظام" کے متعلق گاڈون کہتا ہے کہ:-

"اندھا شاہی بہر حال ایک شر ہے۔ اس کے علمبردار تزک و احتشام کے مظاہروں اور نمائشوں کے بل پر پل رہے جاتے ہیں اور اجتماعیات میں وہ ایک جھوٹی قدر حاصل کر لیتے ہیں"۔

ہمارے نزدیک یہ صورت اندھا شاہی نظام کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر انتفاعی نظام کا خاصہ یہی ہے۔ "جناب" میکیاویلی اقتدار ناروا کے حصول اور تحفظ کے لیے بالکل اسی اصول پر مشورہ دیتے ہیں کہ:-

"میں یہاں تک کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اپنے اندر خیر و خوبی کی مختلف اقسام کا رکھنا اور پھر ہمیشہ ان کے تحفظ کی کوشش کرنا تو مضر مقصد ہے، مگر ان کے ہونے کا عیارانہ اظہار کرنا مفید مطلب ہے ـــــ مثلاً رحم دلی، راسخ الاعتقادی، انسانیت پروری، مذہب پسندی وغیرہ میں بڑھے چڑھے ہونے کا اظہار!

گویا "سیاست جدیدہ" کا پدر محترم بھی یہ مانتا ہے کہ دنیا میں ان خوبیوں کی قدر ہے اور ان کے اظہار ہی سے مطلب نکالا جا سکتا ہے اور دوسری طرف اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ انسانی ذہن دھوکا کھا سکتا ہے۔ یہی ہم کہہ رہے ہیں کہ بد دیانت لوگ، دیانتداری کی قبا اوڑھ کر آگے آ سکتے ہیں۔

اقتدار کی ہوس کے ماتحت انتفاع پیشہ گروہوں نے ہی جدید دور کے پروپگنڈہ کے فن کی تشکیل کی ہے اور اسے مسلسل ارتقا دیا ہے۔ یہ لوٹ مار کرنے والے، یہ غلام بنانے والے، یہ انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے گروہ اگر مقتدر نظر آتے ہیں تو فقط اسی نمائش، فریب اور ساحری کے بل پر جس کا ایک پہلو پروپگنڈہ ہے اور دوسرا "حکمت عملی"! اور جس قدر یہ عناصر کسی گروہ میں زیادہ ہوتے ہیں، اتنا ہی وہ زیادہ عیار اور زیادہ مکار ہوتا ہے اور زیادہ صفائی سے اپنی بدباطنی کو چھپا کر جھوٹی قدر و قیمت حاصل کر لیتا ہے۔

ذرا ملاحظہ کیجیے یورپین اقوام کی نوآبادیاتی پالیسیوں کو، ذرا غور سے دیکھیے یک جماعتی ریاستوں کی روش کو، ذرا توجہ فرمائیے اعلانات جنگ اور مقاصد جنگ کی توضیحات پر، ذرا مطالعہ کیجیے نظامِ امن کی تجاویز کا ـــــ آپ دیکھیں گے کہ "اقوام شکار" اقتدار دوں نے اپنے اخلاقی تعفن کو عطر پاشیوں سے چھپانے میں کتنے کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔

آخر جس کے پاس کھرا مال ہو اسے چرب زبانی اور عیارانہ اشتہار بازی اور فریب کارانہ پیکنگ کی ضرورت کیا ہے لیکن جس کا مال کھوٹا ہے وہ اگر زبان اور دماغ سے کام لینے میں زیادہ چستی نہ دکھائے گا تو کون اس کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ "سیاسی منڈی" کے بے ایمان تاجر مجبور ہیں کہ آدمی کی معاشی اور عقلی اور نفسیاتی اور صنفی کمزوریوں کو تاک تاک کر نشانہ بنائیں اور حکمت لادین کو آدم کشی میں استعمال کریں۔

"حکمت اربابِ کیں مکر است و فن
مکر و فن؛ تخریبِ جاں، تعمیرِ تن"

پھر جب ایسے گروہ مقتدر ہو جاتے ہیں تو مکاری کے ساتھ قہاری اور ساحری کے ساتھ قاہری بھی آشامل ہوتی ہے اور جب یہ "شیطان زادیاں" ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خرامِ ناز فرماتی ہیں تو چاروں طرف بسمل ہی بسمل نظر آتے ہیں، مگر فطرت ان کی خدائی کا نقش محو کرنے کے لیے ازسرِنو انسانی ارادہ کو اکسا دیتی ہے۔

طریقِ دعوت کا یہ انداز بتاتا ہے کہ دروغ کو فروغ حاصل کرنے کے لیے اور ناجائز اقتدار طلبی کو سر اٹھانے کے لیے بڑی ہی بناوٹوں اور بڑی ہی چالبازیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ اگر اپنے آپ کو بغیر کسی دلفریب نمائش و آرائش کے پیش کر دے تو شاید کوئی اس کے منہ پر تھوکنے کے لیے بھی تیار نہ ہو۔ جیسے ایک سیدھی سادی گرہستن کو سوسائٹی میں وقعت حاصل کرنے کے لیے کسی خاص کارروائی کی ضرورت نہیں، مگر ایک بیسوا کو سوسائٹی سے اپنا وجود برداشت کرانے کے لیے زرق برق لباس اور قیمتی زیورات اور غازوں اور گلگونوں کی ضرورت ہے۔

پس یہ واضح ہے کہ ہر جماعت کو ظلم اور باطل کا دشمن اور حق اور عدل کا علمبردار ہونا یا کم از کم ثابت کر دکھانا لازم ہے ورنہ اسے بقا نہیں مل سکتی۔ کیا یہ حقیقت اس دعویٰ پر شہادت نہیں دیتی کہ فطرت انسانی حق و عدل کی طلبگار اور ظلم و باطل سے نفور ہے۔

جماعتوں کا نشو و ارتقاء کسی جماعت کا وجود میں آنا تو آسان ہے مگر اس کا تنازع للبقا کی مہم سر کر لینا مشکل ہے۔ لوگ کوئی دعوت سنتے ہی نہیں لبیک اٹھتے، بلکہ طرح طرح کے شکوک و شبہات ان کے ذہن کی تنقیدی حس کو بیدار کر دیتے ہیں اعتراضات اور شبہات کا ایک طوفان چاروں طرف اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دعوت کے علمبرداروں کے نظریات اور پروگرام عقلِ عامہ کی کسوٹی پر مدت تک پرکھے جاتے ہیں۔ نہ صرف نظریات اور پروگرام، بلکہ ان کے علمبرداروں کا خلوص بھی تاپا تولا جاتا ہے۔ عملی میدان میں لوگ دیکھتے ہیں کہ کسی جماعت کے افراد کی زندگیاں کس قسم کی چیز کا مظاہرہ کرتی ہیں، ان کے پاس موجود سے "بہتر" کیا ہے اور اپنے نصب العین کے لیے یہ کتنی قربانیاں دے سکتے ہیں یا قربانیوں سے بچنے کے لیے کہاں کہاں "سودا بازی" کا طریق اختیار کرتے ہیں؟ کہاں ان کا فلسفہ ان کے عمل سے متضاد واقع ہوا ہے؟ یہ لوگ ذاتی فائدوں کے لیے مقصد کو بیچ کھاتے ہیں یا نہیں؟ ان کو کام کرنے کے جو مواقع ہیں انھیں خدمتِ عوام پر صرف کیا گیا یا اپنی کبریائی کا جھنڈا اونچا کرنے کی فکر کی گئی؟ وغیرہ۔

پھر عوام کی تنقید تو خیر دور رس نہیں ہوتی، مگر ہر نئی جماعت کو جن قدیم جماعت بندیوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے اور انھیں ختم کرنے کے لیے جو نئی جماعت بندیاں نمودار ہو جاتی ہیں ان کی طرف سے بڑے بڑے گہرے سوالات جدید دعوت کے فلسفے اور پروگرام کے خلاف اٹھائے جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ عوام میں پھیل جاتے ہیں۔ ادھر عملی میدان میں اس حریفانہ کشاکش کی وجہ سے علمبرداران دعوت کو ذاتی اور جماعتی دونوں پہلوؤں سے بڑے بڑے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بڑے بڑے مفاد سے ہاتھ دھونے کی نوبت آتی ہے۔ یہ آزمائش کی بھٹی اس لیے سلگائی جاتی ہے کہ کھوٹ اور میل میدانِ سیاست سے الگ ہو جائے۔

اس تنقید اور کشمکش کا مدعا بھی یہی ہے کہ حق و عدل کے علمبردار ابھریں اور ظلم و باطل کے فرزند شکست کھائیں۔ عوام کی

خدمت کرنے والا گروہ آگے ہو جائے اور ان سے نفع اندوزی کرنے والے پیچھے ہٹ جائیں. مگر جو بات ہم نے طریقۂ دعوت کے زیرِ عنوان عرض کی تھی اسی کو یہاں بھی مدِ نظر رکھیے۔ یعنی انفع گروہ کا سیدھا سادہ فلسفۂ تنقید کی کسوٹی پر اپنے آپ کو پیش کر دیتا ہے اور اس کی عملی سرگرمیاں بھی بے دھڑک آزمائش کی بھٹی سے گذر جاتی ہیں مگر انفع نما گروہ اپنے فلسفہ کو بچانے کے لیے خود کسوٹی ہی کو کھوٹی ثابت کرنے کی فکر کرے گا اور عملی میدان میں بھی آزمائش کی بھٹی سے کترانے کی کوشش کرے گا کبھی اس پر لیکچر دے گا کہ بھٹی کی آنچ انسانی برداشت سے زیادہ تیز ہے اور پھر ہر آنچ کے بعد زیادہ بھڑکیلا ملمع کر کے اپنا مال بازار میں لائے گا۔ اس طرح وہ بقا کے لیے جد و جہد کرے گا۔

لیکن اس "جہد للبقا" میں "انتخاب اقویٰ" کا قانون ہرگز کام نہیں کرتا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ مقتدر جماعتیں کبھی فنا نہ ہو سکتیں اور مظلوم عناصر کبھی مقتدر نہ ہو سکتے۔ قوی جماعتوں کا مٹ جانا اور کمزور جماعتوں کا طلوع ہونا اس دعویٰ پر گواہ ہے کہ جماعتوں کی جہد للبقا میں انتخابِ اقویٰ کی جگہ "انتخابِ انفع" کا قانون عمل کرتا ہے۔ قوت تو منتہائے مقصود ہے اور اسی کے متعلق ہمارے سامنے یہ سوال حل طلب ہے کہ اس مقصود کو پانے کے لیے کس خصوصیت کی ضرورت ہے۔ یقیناً اس کا وہی جواب ہے جو ہم مضمون کی ابتدا میں عرض کر چکے ہیں کہ دنیا طاقت اس گروہ کے حوالے کرنا چاہتی ہے اور اسے قیادتِ علیا کا منصب تفویض کرنے پر مائل ہوتی ہے جس سے اسے "خدمت" کی توقع ہو ـــ سب سے زیادہ خدمت کی توقع! اور جہاں بھی اس کا بس چلے وہ خدائی جمانے والوں کو اقتدار کی طرف قدم بڑھانے سے روکنا چاہتی ہے۔

بہر حال جماعتیں بقا کی یہ جنگ لڑ کر اقتدار کا قلعہ جبھی فتح کر سکتی ہیں کہ وہ حق و عدل کے اسلحہ استعمال کریں۔ ہاں اقتدار پانے کے بعد انفع اور انفع نما جماعت کو الگ الگ پہچاننے میں کوئی بڑی دشواری نہیں رہتی مخلص انفع جماعت نے تو اقتدار لیا ہی اس غرض کے لیے تھا کہ انسانیت کی خدمت کر سکے۔ پس وہ جس انسانی آبادی سے قوت حاصل کرتی ہے اسی کی خدمت سرانجام دے کر حساب چکاتی جاتی ہے۔ اس طرح خدمت کے "کاروبار" کا ایک چکر چلتا ہے:-

"خدمت سے قوت اور قوت سے خدمت"

لیکن انفع نما گروہ کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ جب غالب ہو چکتا ہے تو اس کی بدباطنی کھلتی ہے اور اس نے خدمت سے جو قوت حاصل کی ہوتی ہے اسے دوسری طرف انتفاع میں استعمال کرتا ہے۔ جیسے برٹش پارلیمنٹ عالمگیر نقطۂ نظر سے برطانیہ کی خادم ہے۔ نوآبادیات سے انتفاع کرتی ہے۔ امریکہ کی مقتدر قوت سرمایہ داروں کی خادم اور ادنیٰ طبقات کے لیے ظالم ہے یا کانگریس جو ہندوؤں کے لیے مفید اور مسلمانوں کے لیے مضرت کی سعی کر رہی ہے، وغیرہ۔ سو انفع نما جماعت کا عملیہ اس اصول پر ہوتا ہے:-

"خدمت سے قوت اور قوت سے انتفاع"

مگر پھر بھی "خدمت" سے قطعی خالی ہو کر کسی گروہ کا بقا پانا ناممکن التصور ہے۔ اس کی طبعی ذمہ داری ہی خدمت ہے۔ بس ظلم اس وجہ سے نمودار ہوتا ہے کہ خدمت کا دائرہ سکڑ کر پوری اولادِ آدم کو اپنے دائرہ میں لینے کے بجائے ایک محدود عنصر پر محیط

رہتا ہے۔ اور یہ تقسیم چونکہ خود ایک ظلم ہے اس وجہ سے اس کے عمل پر خدمت کا اطلاق اصولاً نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اس محدود "خدمت" اور "انتفاع" سے تائید و مزاحمت کی جو دو متصادم اخلاقی قوتیں رونما ہوتی ہیں ان کی کمی بیشی آگے چل کر فیصلہ کر دیتی ہے کہ کسی گروہ کو اقتدار کا حق تھا یا نہیں!

جماعتوں کی فنا خود جماعتوں کا مٹ جانا کیا شہادت دیتا ہے؟ وہ کیا چیز ہے جس کے ختم ہونے کے بعد قوموں اور سلطنتوں کے اجتماعی وجود دم توڑ دیتے ہیں؟ بہرحال جماعتوں کی فنا کا راز توجہ طلب ہے، جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ:۔

اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُوْنِ۔ کیا اس سے ان لوگوں کی رہنمائی نہیں ہوئی کہ کتنی ہی قومیں ٹھکانے لگائی جا چکی ہیں؟ ہاں فی الواقع قوموں اور گروہوں کی موت پر اگر ہم غور کریں تو وہ نکتہ پکڑ سکتے ہیں جو ان کی تباہی کا راز ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ اگر سیاسی تمکن کی بنا اور جماعتی زندگی کی بقا محض مادی قوت پر منحصر ہوتی تو جو جماعت ایک دفعہ مادی قوت پا لیتی اس کا اقتدار دوامی ہوتا، پھر فراعنہ کی خدائی کبھی نہ مٹتی، نمرود کا تخت کبھی نہ الٹا جاتا، سکندر اور چنگیز کے تاج زمانہ کے سیلاب میں ہرگز نہ بہہ سکتے، زار روس کا نظام کبھی درہم برہم نہ ہوتا۔ کیا وجہ ہے کہ تاجوں کے ہیروں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے، تلواریں زنگ آلود ہو جاتی ہیں، عساکر پر شوکت درہم برہم ہو جاتے ہیں اور طاقتور "پرانے" کی جگہ کمزور "نیا" برسر اقتدار ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعتیں جو ایک دفعہ اقتدار کی منزل کو جا پہنچتی ہیں، انھیں موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے دعاوی کا صدق و کذب اپنی کارگذاریوں سے واضح کر لیں۔ انھیں ڈھیل دی جاتی ہے کہ تمدن و سیاست کی مشین کو اپنی مرضی کے مطابق چلا لیں، تا آنکہ ان کی پوری آزمائش ہو کر عوام پر حقیقت کھل جائے کہ فلاں گروہ خدمت کا علمبردار ہے یا انتفاع کا؟ جب اس امتحان کے نتائج نکل آتے ہیں تو انسانی ارادہ یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ کوئی مدعیٔ خدمت گروہ اپنے دعوئے میں سچا تھا یا نہیں؟ اور اگر اس کا جھوٹ کھل جاتا ہے تو انسانی ارادہ اس کے خلاف زور کر کے اسے ختم کر دیتا ہے۔ فطرت بلا واسطہ جو فرائض سرانجام دیتی ہے ان میں اسے تجربہ کی ضرورت نہیں مگر جو معاملات انسانی شعور کے واسطے سے طے کرنے ہوتے ہیں ان میں انسانی شعور کو تجربہ کرائے بغیر کام نہیں چلتا۔ چنانچہ تاریخ اسی قسم کے لاکھوں تلخ تجربات کا ایک مجموعہ ہے۔ جب کبھی انسان کا اجتماعی شعور کسی گروہ کی طرف انگلی اٹھا دیتا ہے کہ ہمیں اس سے فلاح کی توقع ہے تو فطرت اجازت دیتی ہے کہ اپنے انتخاب کو آزما لو۔ لیکن اس نے ظلم و باطل کے خلاف جو شدید نفرت دلوں میں پیدا کر دی ہے وہ فطری امتحان میں ناکامیاب ہونے والے گروہ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی نفرت کے ماتحت انقلابی تحریکوں اور جنگوں کا ظہور ہوتا ہے جو اصلاً ظلم و باطل کا قلع قمع کرنے کے لیے نمودار ہوتی ہیں اور اگر خدانخواستہ ظلم و باطل کے خلاف انقلاب اور لڑائی کا ظہور نہ ہوتا تو دنیا جہنم سے ہزار گنی بدتر ہوتی۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔ اگر خدا کا قانون ایک انسانی گروہ کو دوسرے گروہ سے متوازن نہ کیا کرتا تو زمین بے امنی کا گھر ہوتی۔ یہ اسی قانون کا فیض ہے کہ ہر گروہ متقدر موت سے بچنے کے لیے کسی

کسی حد تک متقدمین کی تاریخ سے عبرت پکڑتا ہے اور اپنے آپ کو بہتر دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔

"انفع" گروہ جو نظامِ حق و عدل کا علمبردار ہو، کوئی وجہ نہیں کہ انسانیت اس کے خلاف زور کرے اور انقلاب برپا کرے۔ محدود فتنہ انگیزیاں ان لوگوں کی طرف سے ظاہر ہو سکتی ہیں جو خود انتفاع کے خوگر رہے ہوں مگر اخلاقی کمزوری کی وجہ سے یہ طاقت نہیں پکڑ سکتیں۔ زیادہ سے زیادہ خطرہ "نظامِ خدمت" کو ان بیرونی گروہوں سے ہو سکتا ہے جو اس سے پوری طرح متعارف نہ ہوں یا اپنی خداوندیوں کو اس کی تاخت و تاراج سے بچانے کے لیے عوام کو فریب دے کر اس سے لڑا دیں ــــــ مگر عین میدانِ جنگ میں نظامِ انفع اپنی اخلاقی بلندیوں سے دشمنوں کو فتح کر سکتا ہے۔ ہاں اگر نظامِ انفع کے علمبرداروں کے سینوں میں جذباتِ خدمت سرد پڑ جائیں اور جذباتِ خودغرضی ابھر آئیں اور وہ اپنے نظام کو انحطاط کی راہ پر اس حد تک دھکیل لے جائیں کہ وہ "غیر انفع" ہو کے رہ جائے اور ظلم و باطل کو وہ اپنے اندر جذب کر لے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ فطرت اور انسانی شعور اس سے کوئی نرمی برتے۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد اسے "امامتِ عصر" کا حق نہیں رہتا۔

دوسری طرف "انفع نما" گروہوں کی ساری انفعیت اسی وقت تک ہوتی ہے کہ انھیں تمکن مل جائے۔ اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ اپنی انتفاعی سرگرمیوں کو آشکارا کرنے لگتے ہیں اور اس طرح جتنی جتنی مادی طاقت ان کے خزانے میں زیادہ ہوتی جاتی ہے، عاقبت اندیشی اتنی ہی کم اور عوام کے احساسات سے بے نیازی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ اس مادہ پرستانہ طرزِ عمل سے مادی قوت کا اضافہ اور اخلاقی دیوالیہ پن متوازی طور پر تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ اخلاقی دیوالیہ پن کی تکمیل کا مطلب یہ ہے کہ ظلم اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور مظلوم عناصر پوری اخلاقی قوت کے ساتھ انتقام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

یہ صورت تو "درون خانہ" نمودار ہوتی ہے مگر ظلم "بیرون خانہ" بھی اپنے قاتلوں کو دعوتِ تیغ آزمائی دیتا ہے۔ نظامِ انتفاع اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ "کمزوری" سے فائدہ اٹھائے۔ پس اسے جہاں بھی دنیا میں کوئی کمزور ہیئتِ اجتماعی نظر آتی ہے وہ اسے شکار کر لینا چاہتا ہے۔ پھر دنیا کئی ٹکڑوں میں منقسم اور کئی نظام ہائے انتفاع کا گہوارہ ہے۔ اس وجہ سے ہر قوی گروہ کی نظر قابلِ صید اقوام پر رہتی ہے۔ اس طرح مختلف جماعت بندیوں کی طاقتیں ایک دوسرے کی حریف و رقیب بنتی ہیں اور مزید یہ کہ جہاں رقابت کی کوئی وجہ بالفعل نہیں ہوتی وہاں خود رقابت کا اندیشہ رقابت ہی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ یعنی جنگ! اس طرح نظامِ انتفاع ہر لحظہ خطرات میں گھرا رہتا ہے۔ یہ سب اہتمامات گواہ ہیں کہ فطرت انتفاع، ظلم اور باطل کو انسانی زندگی میں متقدر دیکھنے پر راضی نہیں ہے۔

آپ اگر قریب ترین چند صدیوں کی جہانی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو یہ اندازہ ہو گا کہ خالص عالمگیر انسانی نقطۂ نظر سے اس طویل دور میں صرف انفع نما جماعتیں ابھرتی رہی ہیں، یعنی جن کے پیشِ نظر محدود انسانوں کا مفاد تو تھا مگر ایک خاص حلقہ سے باہر کی دنیائے انسانیت ان کے لیے ایک شکارگاہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ دورِ رواں کی پوری تاریخ انفع نما جماعتوں کی تاریخ ہے جو اساسی اصولوں میں متحد مگر عملی ضوابط میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

عالمگیر النفعیت جماعتوں کا یہ مسلک کہ ادھر خدمت ہو اور ادھر انتفاع، راست بیں انسانی نقطۂ نظر سے عدل نہیں ہے۔

اور جب یہ روش عدل نہیں ہے تو پھر اس کی اساس جن نظریات پر قائم ہے ان کا باطل ہونا بھی از خود واضح ہے۔ عدل نام ہی اس چیز کا ہے کہ فکر و عمل کے ترازوؤں کے دونوں پلڑے برابر رکھے جائیں۔ اپنی نسل اور دوسری نسلیں، اپنی قوم اور دوسری قومیں، اپنا طبقہ اور دوسرے طبقات، اپنی برادری اور دوسری برادریاں، اپنی ذات اور دوسرے اشخاص ایک ہی کانٹے پر ایک ہی باٹ سے تلیں۔ اگر بحیرۂ روم کے اس جانب آزادی و حریت کا استحقاق بنی آدم کو حاصل ہو تو اس جانب کے انسانوں کو بھی اس کا مستحق مانا جائے۔ اگر عزت و احترام کا حقدار سفید فام امریکن ہو سکتا ہے تو ریڈ انڈین کو بھی اس میں شریک ہونے کا مساویانہ موقع حاصل ہو۔ پھر اگر انگلینڈ کی سطوت کو بچانے کے لیے انگریز لڑتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ ہندوستان کی شوکت کو بحال کرنے کے لیے بھی اسی جانفشانی سے لڑے، چاہے اسے میدان جنگ میں اپنے باپ اور بھائیوں ہی پر کیوں نہ گولی چلانی پڑے۔ اسی طرح روس جو اپنے فرزندوں کو جرمنی کی دست برد سے بچانے کے لیے جان لڑاتا رہا ہے اس کو خود اپنی دست برد سے جاپان، ایران، ترکی اور یورپین ممالک کو بھی بچانا چاہیے۔ اگر اس کے ہاتھ کمزوروں کو دبوچنے کیلیے بے اختیار ہو جائیں تو اس کے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ ان ظالم ہاتھوں کو کاٹ کے الگ پھینک دے۔ مگر نہیں ان سب گروہوں کی انفعیت محدود ہے۔

عالمگیر انفعیت کی اہمیت کو تو محسوس کیا گیا ہے، اب نہیں بلکہ گذشتہ جنگ عظیم نے ہی انسان کو اس طرف متوجہ کر دیا تھا۔ مگر آہ کہ اس کے لیے صحیح اساسی اصول نہ ملنے اور اس کیلیے پر خلوص موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ نمودار نہ ہو سکی جمعیت اقوام نے اسی احساس کے ماتحت جنم لیا تھا مگر ناکام منقصد ہو کے آج وہ قبر عدم میں مدفون ہے۔ پھر اسی اساس سے اوقیانوس چارٹر ابھرا لیکن چارٹر کے مصنفین کے غیر مخلصانہ طرز عمل نے اسے اوقیانوس کی لہروں کی نذر کر دیا، پھر یہاں فرانسسکو میں بظاہر اکابر عالم اسی احساس کے ماتحت سر جوڑ کر بیٹھے مگر یہ کانفرنس بھی امن پسند اور اقتدار پسند عناصر کی داستان کشمکش سے زیادہ کچھ نہ تھی اور اس میں "نشستند و گفتند و برخاستند" سے آگے اگر کچھ ہوا بھی تھا تو اسے فاتحین عالم کی فاتحانہ حرکات نے دامن وقت سے دھو دیا ہے۔

عالمگیر انفعیت اگر کسی گروہ میں پائی جائے تو اس کی مزاحمت کسی قوت کی طرف سے محض غلط فہمیوں اور بد دیانتیوں کے ماتحت ہو گی۔ صحیح معلومات اور خلوص کے ہوتے ہوئے پوری دنیا کے مفاد کے خادموں کی مزاحمت کوئی نہیں کر سکتا اور جو وطنی اور نسلی گروہ بندیاں اس کے مقابلہ میں آتی ہیں ان کے قدم کبھی جم نہیں سکتے۔

عرب کی جماعت اسلامی اب اس طرز کی جماعت کی مثال دور رواں میں اگر نہ مل سکے تو پھر ہمیں اجازت دیجیے کہ ذرا اور پیچھے ہٹ کر آپ کو ایک ایسی جماعت سے متعارف کرا دیں جس سے آپ کو چاہے محبت ہو یا نفرت مگر ہمارے معیار پر وہی پوری اترتی ہے۔ ہمارے پیش نظر ساڑھے تیرہ سو سال پہلے عرب میں نمودار ہونے والی جماعت اسلامی ہے۔

اس جماعت کا ظہور پوری انسانیت کو ہر نوعیت کے ظلم سے بچا کر عدل کی راہ پر چلانے کے لیے ہوا تھا اور اسی وجہ سے اس کے مسلک کا عنوان ہی "مسلک امن" (اسلام) تھا۔ اس کا بنیادی نظریہ سیدھا سادہ تھا کہ اصلاً اقتدار "خدا" کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے، نہ سیاست میں، نہ معیشت میں، نہ معاشرت میں ـــــ اور سب انسان اس کی رعایا ہیں جن

میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہونی چاہیے کہ کوئی حاکم ہو کوئی محکوم، کوئی جابر ہو کوئی مجبور، کوئی ظالم کوئی مظلوم ـــــ یہ مرکزی دعوت اتنی سادہ تھی اور اتنی سادگی سے پیش کی گئی تھی کہ عرب کا ایک جاہل بدو بھی اسے دو سکنڈ میں سمجھ لیتا تھا کہ زندگی پر اس کا اثر کیا ہوگا۔ پہلے مظلوم اور محکوم اور مجبور اس دعوت کی طرف کھنچے اور ان کے ساتھ متقدرین میں سے بھی سلیم الفطرت عنصر نے اس ناقابلِ انکار بنیادی صداقت کو اول ہی میں قبول کر لیا مگر استغلال وظلم کے کچھ علمبردار اپنے ذاتی مفاد کے تحفظ کے لیے انسانیت کے خیر خواہوں کے مقابلہ میں بھرپور مادی قوت کے ساتھ اڑے۔ مگر اس گروہ کی اخلاقی قوت نے ان کی مادی قوت کو شکست دے دی۔ اس دوران میں باصطلاح جدید "پروپگنڈا" نہیں کیا گیا اور کسی مظاہرہ تنظیم کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ بس ایک سیدھے سادے اصول کی تبلیغ تھی اور اسی کے مطابق تشکیل پانے والے امانتدارانہ، کریمانہ اور دیانتدارانہ اخلاق کا خاموش حملہ تھا جو جوق جوق لوگوں کو فتح کرتا گیا۔

پھر جب اس گروہ کو غلبہ ملا تو اس نے اپنی عیاشی کے سامان نہیں کیے۔ اس نے اپنے معاشی مفاد کے لیے کبھی کوئی جنگ نہیں کی۔ اس نے اپنے ہم نفس اور ہم وطن بھائیوں کو خداوندی دلانے کے لیے تلوار اور قانون کو استعمال نہیں کیا، اس نے زیرِ اقتدار آبادی کا خون کبھی نہیں نچوڑا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایران قومیت کے نشہ میں سرشار ہو کر اس سے لڑنے نکلا، مگر اس یقین کے ساتھ کہ میری مغلوبیت مقدر ہو چکی ہے اور ہسپانیہ نے تو خود اس گروہ کے ایک گورنر سے خواہش کی کہ آ اور مجھے فتح کر لے۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بامیدِ آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

پھر ایک مفتوح علاقہ سے جب اس گروہ کو فوجی وسیاسی تسلط اٹھانے کی ضرورت پیش آئی تو اس کے باشندے رو رو کے کہتے تھے کہ ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ، ہم تمہارے نظام کے ماتحت جینا چاہتے ہیں۔ پھر سیاسی تسلط اٹھانے کے ساتھ جزیہ (معاوضۂ انتظام) کی گراں بہا رقم کی واپسی نے اس گروہ کے خادمِ انسانیت ہونے کو قطعی طور پر ثابت کر دیا۔ کیا دنیا بھر کی جدید سیاسی تاریخ میں سے ایسا ایک واقعہ بھی کوئی تلاش کر کے دکھا سکتا ہے؟ پھر اس گروہ کے ایک امیر کی موت پر متعصب عیسائی پادریوں تک نے سوگ منایا۔

اس گروہ نے سوسائٹی میں توازن پیدا کرنے کے لیے یہ اہتمام کیا کہ کمزوروں کی گردن سے بار اٹھائے اور طاقتوروں کے کندھوں پر رکھ دیے۔ جو جتنا زیادہ ضعیف تھا اس کی ذمہ داریاں اتنی ہی کم اور اس کے حقوق اتنے ہی زیادہ تھے اور جو جتنا قوی تھا اس کی ذمہ داریاں اتنی ہی زیادہ اور حقوق اتنے ہی کم تھے۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے امیر کا حال یہ تھا کہ اسے عیاشی کرنے کی مہلت تو کیا ملتی، ضروری حد تک آرام کرنے کی فرصت بھی نہ تھی۔ اس کا دن پبلک کی خدمت میں اور رات خدا کی بندگی میں گزرتی تھی۔ اس کا کھانا، پہناوا اور رہن سہن عوام سے ایک بال بھر بھی بہتر نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ کسی ایسی چیز کے استعمال سے ہچکچاتا تھا جس کے متعلق اسے یہ یقین نہ ہو کہ پبلک کے ہر ہر فرد کو میسر ہو چکی ہے۔ وہ اس کا ذمہ دار تھا کہ اس کے حدودِ انتظام میں کوئی بھوکا نہ ہو، کوئی دکھی نہ ہو، کسی کا حق نہ چھنے اور کسی پر زیادتی نہ ہونے پائے کتنی ہی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ کسی کو کھانا پہنچانے خود جا رہا ہے، کسی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، کسی کا سودا سلف خرید رہا ہے، کسی

کی تیمارداری یا عیادت میں مصروف ہے اور کسی کوچہ میں لوگوں کی تکلیفیں معلوم کرنے کے لیے گھوم رہا ہے۔

اس گروہ نے کبھی کوئی جنگ، ملک گیری، معاشی صیادی اور غلام سازی کے لیے نہیں لڑی، اس کی جنگ صرف ان نظریات سے تھی جو مختلف استحصالی نظاموں کی اساس بنے ہوئے تھے اور اس کا تصادم ان ظالمانہ وسائلِ حیات سے تھا جنھوں نے اولادِ آدم کو مصیبتوں اور دکھوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔

پس اس گروہ کے خلاف انقلاب اٹھانے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ ہاں مگر قانونِ انحطاط نے ضرور اس پر عمل کیا۔ اور بدنیت لوگوں کو جب اس کے نظامِ خدمت کے کلیدی پرزوں کو چھیڑنے کا موقع ملا تو انھوں نے تحریفی تغیرات سے اس کی چال بدل دی۔ لیکن رائے عامہ کے نمائندہ علما، و ماہرینِ سیاست نے بھی ان تحریفی تغیرات کو روکنے کے لیے تجدیدی مساعی کو ہمیشہ جاری رکھا۔ انہی تجدیدی مساعی کا یہ فائدہ ہوا کہ اندرونی روحِ خدمت پژمردہ ہو جانے کے باوجود قرنوں تک اس نظامِ عدل کا بیرونی ڈھانچہ کسی نہ کسی حد تک برقرار رہا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس گروہ کو آٹھ دس سو سال تک، دنیا کے مختلف گوشوں میں کام کرنے کی مہلت ملی۔ شاید اتنی مہلت پچھلے دور میں کوئی گروہ کبھی نہ پا سکا۔ تاآنکہ نظام کی روح اور ڈھانچہ دونوں قطعی طور پر متغیر ہو گئے۔ نظریاتِ حق فکرِ باطل کے عمل سے مسخ ہو گئے اور ضابطۂ عدل خواہشاتی تغیرات کی وجہ سے ظلم کا سرچشمہ بن گیا۔ اب جب اس جماعت نے عام استحصال پیشہ گروہوں کی سطح پر گرنا پسند کر لیا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اسے محض اس وجہ سے بحال رکھا جاتا کہ کبھی ایسا اور ایسا تھا۔ فطرت "تھا" کو نہیں "ہے" کو دیکھ کر فیصلہ کرتی ہے۔ چنانچہ اس سے جہانی امامت سلب ہو گئی اور اب دنیا جیسی کچھ ہے، آپ کے سامنے ہے۔

اس بحث سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ اے۔ جے۔ سی۔ برنشا کے الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

"انجام کار صرف وہ جئیں گے جو پوری انسانیت کے اصلی تقاضوں کو سمجھ لیں اور انھیں پورا کر سکیں"۔

ایسے ہی ایک گروہ کے ابھرنے کی امید پر انقلاب اور جنگیں نوعِ انسانی کو بار بار الٹ پلٹ رہی ہیں اور یہ فتنہ و فساد کی رَو اس وقت تک انسانی آبادیوں کو ملوث کرتی رہے گی جب تک کہ ان میں سے وہی پاکیزہ اور صاف ستھرا گروہ برآمد ہو جائے۔

ایک آخری سوال

اب پھر وہی سوال ہمارے سامنے آتا ہے جو انفرادی اخلاقی لغزشوں کے وجوہ دریافت کرتے ہوئے اٹھا تھا کہ اگر انسانیت ظلم و باطل کی دافعتہً دشمن ہے اور حق و عدل اسے مرغوب ہیں تو پھر ظلم و باطل کو ابھر آنے کا موقع کیسے ملتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ یہاں بھی نظریوں اور ضابطوں کی ساری خرابیاں انہی وجوہ پر مبنی ہیں جن کا تذکرہ ہم نے انفرادی اخلاقی لغزشوں کے بارے میں کیا تھا۔ یعنی نظریات میں جذبہ آمیز اور خواہش پرستانہ فکر اور تجربی عقل کو مابعد الطبیعی اور تمدنی و حیاتی صداقتوں کی تلاش کے لیے کافی سمجھنا اور ظنیات کو حقائق کا درجہ دینا اور کم معلومات کی بنیاد پر کسی حقیقت کی قطعی تعبیر کر لینا باطل کو در آنے کا موقع دیتا ہے اور ادھر عملیات میں تقسیمِ انسانیت یعنی کسی گروہ کو برتر اور کسی گروہ کو فروتر قرار دینا، انسانی فطرت کو متغیر ماننا، یعنی ملک ملک اور زمانہ زمانہ میں جو اجداد و سائر وضع کرتے پھرنا اور اسی طرح اجتماعی زندگی کو واحد سلسلۂ اعمال کی حیثیت دینے کے بجائے

اس کے تقاضوں کو علٰحدہ علٰحدہ کر کے پیشِ نظر رکھنا اور ہر تقاضے کا حل یک طرفہ نگاہ سے کرنا، وہ لغزشیں ہیں جو ظلم کو کارفرما کرتی ہیں
مگر چاہے ظلم و باطل کے ظہور کی وجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، واقعہ تو یہی ہے نا کہ انسان کو حق و عدل کا تو صرف نام ہی نام مرغوب ہے، ورنہ اس نام سے وہ ہر قسم کے باطل اور ہر قسم کے ظلم کو پسند کرتا رہا ہے۔ کیا اس کا یہی مطلب نہیں ہے کہ نظامِ فطرت ظلم و باطل کی روک تھام اور حق و عدل کے تحفظ و بقا کے لیے کوئی قابلِ اعتماد اسباب نہیں رکھتا؟ یہ اعتراض بجا ہوتا، اگر فطرت نے نظریات اور عملیات میں باطل اور ظلم کے در آنے کو روکنے کی کوئی صورت تجویز نہ کی ہوتی، لیکن درحقیقت اس نے اس کا اتنا قابلِ اعتماد سامان کیا ہے کہ اس سے متعارف ہو جانے کے بعد یہ اعتراض باقی نہیں رہتا۔ ہم جہاں انسان کے ذرائعِ علم کی کمزوریوں کی طرف اور عملی انضباط کے وسائل کی کوتاہیوں کی طرف بار بار اشارہ کرتے چلے آ رہے ہیں، وہاں ہمارا فرض یہ بتانا بھی ہے کہ ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کے ازالہ کے لیے فطرت کیا صورتیں مہیا کر سکی ہے، کیونکہ جب اجتماعیاتِ انسانی میں اس کا سارا عمل انسانی شعور و ارادہ پر منحصر ہے تو لازم ہے کہ وہ اسے کج روی سے روکنے کے ٹھوس وسائل مہیا کرے۔ — وہ وسائل کیا ہیں؟ اس کا جواب ہم اپنے آئندہ مبحث "شاہراہِ ارتقا" میں عرض کریں گے۔

اس بحث سے صرف یہ واضح کرنا مطلوب تھا کہ نظامِ ظلم و باطل اجتماعی زندگی کے لیے کبھی بھی نافع نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ انسانیت اس کے خلاف زور کرتی رہتی ہے اور دوسری طرف نظامِ حق و عدل اس کے لیے فطری طور پر مفید ہے، اس وجہ سے وہ اپنے آپ کو اس کی طرف بڑھانے کے لیے انقلاب اور جنگ کی شاہراہ پر حرکت کرتی ہے۔ مشکل صرف یہ پیش آتی ہے کہ "نتائجِ بد" کے ظہور پر وہ یہ تو محسوس کر لیتی ہے کہ کسی مجموعۂ افکار و ضوابط میں باطل اور ظلم کا دخل ہے مگر تشخیص سا تھ اس کے محدود ذرائعِ علم یہ طے نہیں کر سکتے کہ ٹھیک ٹھیک فلاں فلاں امور میں اتنا اتنا باطل اور ظلم دخیل ہے اور اتنا اتنا حق اور عدل کا عنصر باقی رہ گیا ہے۔ بس تاریکی میں وہ ایک طرف سے ٹھوکر کھاتی ہے تو دوسری طرف مڑ جاتی ہے، پھر ادھر سے جب پاؤں کانٹوں سے چھلنی ہوتے ہیں تو روتی چیختی تیسری طرف لپکتی ہے — مگر چراغ لے کر چلنے سے چڑتی ہے، کیونکہ "دزدان چراغ بکف" سے بہت خوفزدہ ہے۔ بہرحال یہ چڑ کسی طرح دور ہو جائے تو امرِ واقعہ یہ ہے کہ دیا، بتی، تیل سبھی کچھ فطرت نے فراہم کر رکھا ہے۔

فہرست کتب مکتبہ جماعت اسلامی

تفہیمات	۱؍ ۸؍	مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	۱؍ ۱۲؍	پردہ	۲؍	اسلام کیا ہے (انگریزی)	۱؍ ۸؍
دینیات (قسم اول)	۱؍ ۸؍	” ” (حصہ دوم)	۱؍ ۸؍	” مجلد	۳؍	جہاد فی سبیل اللہ	۶؍
” (” دوم)	عہ	” ” (ہر سہ حصہ مجلد)	عہ	حقیقتِ توحید	۱؍ ۸؍	اسلام اور جاہلیت	۶؍
” (انگریزی)	سے	تجدید و احیائے دین	عہ	سلامتی کا راستہ	۶؍	اسلام کا نظریۂ سیاسی	۶؍
مسئلہ جبر و قدر	عہ	روداد جماعت اسلامی (حصہ سوم)	۹؍	نشان راہ	۶؍	دستور جماعت اسلامی	۲؍
خطبات (قسم دوم)	۱؍ ۸؍	” ” (حصہ سوم)	عہ	نیا نظام تعلیم	۶؍	ایک اہم استفتاء	۲؍

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے — ۶؍

انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل — ۶؍

نوٹ:- جن کتابوں کے نام فہرست میں موجود نہیں ہیں ان کے متعلق سمجھیے کہ وہ اسٹاک میں ختم ہیں

رسائل و مسائل

برکت بانٹنے کا فتنہ

سوال:- احادیث کا ترجمہ چھوٹے چھوٹے رسائل کی شکل میں "آسان حدیث یا انمول موتی" کے نام سے بھوپال سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی ایک قسط میں فضیلت نبی کے عنوان سے یہ روایت درج ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کی نماز سے فارغ ہو جاتے تو مدینہ والوں کے خدمت گار اور غلام برتنوں میں پانی لے کر آتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہاتھ ایک ایک برتن کے پانی میں ڈالتے حتیٰ کہ شدید سردی میں بھی انکار نہ کرتے۔ اس کی تشریح میں یہ لکھا گیا ہے کہ بزرگ ہستیوں سے اس طریقہ سے برکت حاصل کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس معاملہ میں نبی اور ایک امتی بزرگ میں کوئی فرق نہیں ہے؟

جواب:- اس مضمون کی حدیث مسلم شریف وغیرہ میں موجود ہے۔ اس وجہ سے فی نفسہٖ واقعہ سے تو انکار نہیں ہو سکتا البتہ اس سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے۔ اس کے بعض پہلو قابل غور ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ نبی اور ایک امتی میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ یعنی نبی معصوم ہوتا ہے اور اس کا صاحبِ فیض و برکت ہونا قطعی ہے پھر اس کا مقرب خدا ہونا خود اس کو بھی معلوم ہوتا ہے اور دوسرے اہل ایمان بھی اس کی اس حیثیت کو جانتے ہیں۔ لیکن کسی امتی کو یہ باتیں اولاً تو اس درجہ تک حاصل نہیں ہوتیں اور اگر کسی حد تک اس کو خدا کا تقرب حاصل بھی ہوتا ہے اور اس کے اثر سے وہ صاحب برکت بھی ہوتا ہے تو ہم اس کے مقرب خدا اور صاحب برکت ہونے کا صرف گمان کر سکتے ہیں، رہا یہ کہ فی الواقع وہ ایسا ہے یا نہیں، اس کی بابت نہ تو ہم کوئی قطعی علم رکھتے ہیں اور نہ کوئی بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں خدا کے ہاں اس کا درجہ کیا ہے اور اس کے اعمال مقبول ہیں یا مردود! چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کسی کی نیکی اور تقویٰ کی تعریف میں یہ کہا گیا کہ فلاں ایسا اور ایسا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح مت کہو، بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اس کو ایسا اور ایسا پایا ہے۔ اس وجہ سے ہر عالم یا شیخ یا پیر کو ایک بت بنا لینا جیسا کہ اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں، کوئی صحیح اور معقول صورت نہیں معلوم ہوتی۔

اور اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو تو بہت زیادہ خطرناک ہے۔ عوام اگر حصول برکت کے لیے علماء و مشائخ کے پاس ہجوم کرتے ہیں تو اس کو ان کی سادگی اور جہالت پر محمول کیا جا سکتا ہے اور ممکن ہے کہ ان کی سادگی اور جہالت ہی ان کے لیے اللہ کے یہاں بھی عذر بن سکے، لیکن جو حضرات کہ بے تکلف اپنے آپ کو مقرب خدا اور منبع خیر و برکت مان کر برکت تقسیم کرنا شروع کر دیتے ہیں اور بے دریغ اس جگہ بیٹھ جاتے ہیں جو صرف نبی اور کسی مبشر بالجنۃ ہی کے لیے موزوں ہو سکتی ہے وہ تو اپنے ایمان کو سخت فتنہ میں ڈال دیتے ہیں اور اس طرح کے اشخاص سے ہمیں بدگمان کر دینے کے لیے ان کی یہ جسارت کافی ہے کہ وہ خود اپنے صاحب برکت ہونے کا عملی دعویٰ رکھتے ہیں۔ آج ہر مدرسہ اور خانقاہ میں برکت حاصل کرنے اور برکت تقسیم کرنے کا بازار گرم ہے اور برکت تقسیم کرنے والے حضرات ان

طرح کی احادیث کو اپنے لیے دلیل ٹھیراتے ہیں کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے خدمتگاروں اور غلاموں کو برکت بخشتے تھے تو آخر یہی حق انھیں اپنے مریدوں اور عقیدت کیشوں کے لیے کیوں نہ حاصل ہو؟ ہمارے نزدیک تو اس طرح کے لوگ سخت فتنہ اور کبر نفس میں مبتلا ہیں۔ اور کسی محتاط اور خداترس آدمی کے لیے ہم یہ بات جائز نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے ایمان کو اس طرح کی آزمائش میں ڈالے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات کا جہاں تک ہمیں علم ہے، باوجود تمام خصائص تقدس کے حامل ہونے کے "درشن دینے" اور "برکت بانٹنے" سے سخت احتراز کرتے تھے، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس طرز عمل سے آج ہمارے مشائخ سند پکڑتے ہیں اس کو اُن حضرات نے برأی العین مشاہدہ کیا تھا، اور قرآن ان کی نیکی اور تقوی پر گواہ تھا۔

"اجماع" اور "سواد اعظم" کی غلط تعبیریں

سوال:۔ ایک صاحب یہ حدیث بیان کرکے کہ "لا تجتمع امتی علی الضلالۃ" فرماتے ہیں کہ اجماع امت غلط بات پر نہیں ہوسکتا۔ پس جب علمائے ہند کی اکثریت جمعیۃ العلماء میں جذب ہوکر یہ فیصلہ کرچکی ہے کہ اس وقت کانگریس کے ساتھ ہی اشتراک عمل عین اسلام کے مطابق ہے تو یہ بھی غلط نہیں ہوسکتا۔ یہ صاحب اجماع امت سے مراد علمائے امت کا ہم خیال ہوجانا لیتے ہیں۔ براہ کرم اس حدیث شریف کے مفہوم اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

جواب:۔ "ان اللہ لا یجمع امتی علی الضلالۃ" والی حدیث اور اسی طرح کی دوسری حدیثیں جو اتباع سواد اعظم یا جماعت سے متعلق وارد ہیں مسلم لیگ اور کانگریس کے حامیوں کے درمیان ایک عرصہ سے نہایت بے دردانہ استعمال ہورہی ہیں۔ اور ان میں سے کسی خدا کے بندے کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ان احادیث کے موقع و محل اور ان کے صحیح مفہوم پر غور کرلے۔ مسلم لیگ کے حامی کہتے ہیں کہ جب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو ضلالت پر اکٹھا نہیں کرے گا، اور مسلمانوں کی اکثریت مسلم لیگ کے لیڈر اور مسلم لیگ کے نظریہ پر متفق ہوگئی ہے تو لازماً یہی راستہ ہدایت کا راستہ ہے اور جو مسلمان اس سے الگ ہیں وہ مفارق جماعت کے حکم میں داخل اور "من شذ شذ فی النار" کی وعید کے مستحق ہیں۔ اور کانگریسی حضرات کا استدلال وہی ہے جس کا اوپر حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ اسلام میں نہ اکثریت کا کسی بات پر متفق ہوجانا اس کے حق ہونے کی دلیل ہے، نہ اکثریت کا نام سواد اعظم ہے، نہ ہر بھیڑ جماعت کے حکم میں داخل ہے، اور نہ کسی مقام کے مولویوں کی کسی جماعت کا کسی رائے کو اختیار کرلینا اجماع ہے۔ ان ساری غلط فہمیوں سے تعرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، البتہ مذکورہ بالا حدیث کا مطلب ہم بیان کیے دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا حدیث ترمذی میں ان الفاظ کے ساتھ وارد ہے "ان اللہ لا یجمع امتی او قال امۃ محمدٍ علی ضلالۃ و ید اللہ علی الجماعۃ و من شذ شذ فی النار"۔ (اللہ تعالیٰ میری امت کو یا یوں فرمایا کہ محمدؐ کی امت کو ضلالت پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں پڑا۔) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امت پر کوئی دور ایسا نہیں آئے گا کہ یہ پوری امت گمراہی میں پڑ جائے، بلکہ اس میں ایک گروہ، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو، ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور وہی جماعت ہے اور اللہ کا ہاتھ اس جماعت پر ہے اور جو اس جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں گرا۔ اس مطلب کی تائید اس حدیث نبوی سے ہوتی ہے جو عبداللہ ابن عمرؓ سے بایں الفاظ مروی ہے:۔

ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلھم فی النار الا ملة واحدة ۔ قالوا من ھی یا رسول اللہ؟ قال ما انا علیہ واصحابی!

بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی جو سب کے سب جہنم میں پڑ جائیں گے، بجز ایک کے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کون لوگ ہوں گے یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا! جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر ہوں گے۔

احمد اور ابوداؤد کے یہاں یہی روایت کسی قدر مختلف الفاظ میں ہے اور ان میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہی فرقہ جو آپ کے اور آپ کے صحابہ کے طریق پر ہوگا، جماعت ہے اور اسی کے اوپر اللہ کی رحمت کا ہاتھ ہے۔ عن معاویہ، ثنتان وسبعون فی النار وواحدة فی الجنة، وھی الجماعة (معاویہؓ سے روایت ہے کہ بہتر فرقے جہنم میں ہوں گے، ایک جنت میں ہوگا اور وہی جماعت ہے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ اس امت پر ایسا آئے گا جبکہ اس کے بڑے حصہ میں ضلالت کا اثر اسی طرح سرایت کر جائے گا جس طرح باؤلے کتے کے کاٹنے سے اس کا زہر آدمی کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے صرف تھوڑے لوگ بچے رہیں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے طریق پر ہوں گے، اور وہی لوگ جماعت کے حکم میں ہوں گے۔ بعینہٖ اسی مضمون کی ایک حدیث اور بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:-

لا تزال طائفة من امتی علی الحق ......الخ

میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، جو لوگ انہیں چھوڑیں گے، ان کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔

ان احادیث کی روشنی میں زیر بحث حدیث کا مطلب یہ نکلا کہ یہ پوری امت کبھی گمراہ نہ ہوگی، بلکہ ایک جماعت خواہ وہ کتنی ہی مختصر ہو، حق پر قائم رہے گی اور وہی جماعت ناجی ہے، اُسی کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے، بقیہ سب جہنم میں پڑیں گے۔ ان احادیث سے یہ امر بھی بالکل واضح ہے کہ یہ گروہ نہ کثرت میں ہوگا، نہ اپنی کثرت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھہرائے گا، بلکہ اس امت کے ۷۳ فرقوں میں سے ایک ہوگا اور اس معمورۂ دنیا میں ان کی حیثیت اجنبی اور بیگانہ لوگوں کی ہوگی، جیسا کہ فرمایا ہے "بدء الاسلام غریبا وسیعود کما بدء، فطوبی للغرباء ھم الذین یصلحون ما افسد الناس بعدی من سنتی" (اسلام غربت میں شروع ہوا اور اسی غربت میں پھر مبتلا ہوگا، پس مبارکباد ہے ان "اجنبیوں" کے لیے جو دوسروں کے بگاڑے ہوئے دین کی اصلاح کریں گے)

پس جو جماعت محض اپنی کثرتِ تعداد کی بنا پر اپنے آپ کو وہ جماعت قرار دے رہی ہے جس پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جس سے علیحدہ ہونا جہنم میں داخل ہونے کے مرادف ہے، اس کے لیے تو اس حدیث میں امید کی کوئی کرن نہیں، کیونکہ اس حدیث میں اس جماعت کی دو علامتیں نمایاں طریقہ پر بیان کر دی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے طریق پر ہوگی، دوسری یہ کہ نہایت اقلیت میں ہوگی۔

رہے کانگریسی حضرات، تو ان کا استدلال بھی بالکل مہمل ہے۔ اول تو اس حدیث کا تعلق اجماع سے بالکل ہے ہی نہیں بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی مقام کے چند عالموں کا کسی راہ کو اختیار کر لینا وہ اجماع نہیں ہے جو شریعت میں معتبر ہے۔ شریعت میں معتبر اجماع وہ ہے جس پر مسلمانوں کا امیر اور اس کے ارباب حل وعقد مجتمع

ہو جائیں۔ یہی اجماع سند ہے، یہی کتاب و سنت سے ثابت ہے، یہی طریقہ سلف صالحین سے معلوم ہے اور یہی موافق عقل ہے۔ رہی مولویوں کی کثرت، وہ اولاً تو کانگریس کی تائید میں ہے نہیں، اور اگر ہو بھی تو مولویوں کی کوئی مقدار بھی کسی بات کو شرعی اجماع کی حیثیت نہیں دے سکتی جب تک اجماع کے شرائط موجود نہ ہوں۔

یہاں زیر بحث حدیث سے متعلق ایک بات اور یاد رکھیے کہ اس امت میں ایک گروہ کو (خواہ وہ کتنی ہی قلت میں ہو) حق پر قائم رکھنا مصلحت دینی کے لیے ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم فرما دی ہے اس وجہ سے دو باتیں ضروری ہوئیں، ایک یہ کہ قرآن ہمیشہ کے لیے ہر طرح کی تغییر و تبدیل سے محفوظ کر دیا جائے، دوسری یہ کہ خلائق پر دین کی حجت تمام کرنے کے لیے اس امت کے اندر ایک جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے۔ اس جماعت کی علامت یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے طریق پر ہو اور اپنے ہر قول و عمل کو اس کسوٹی پر جانچنے کے لیے تیار رہے۔

ارتداد اور تبلیغ کفر کو روکنے میں جبر کا استعمال

سوال:۔ اسلام میں قتل مرتد کا حکم کس آیت قرآنی سے استنباط کیا گیا ہے؟ مولانا مودودی صاحب نے ایک ہندو کے سوال کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ "ہم کسی مسلمان کو اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اپنا دین تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیں گے"۔ اس جواب سے دین اسلام کے منوانے میں جبر کا جواز نکلتا ہے۔ یہ چیز غیر مسلم اقوام کے لیے اسلام پر حملہ کرنے کے لیے ایک محفوظ مورچہ بن گئی ہے۔ آخر ایسا جبری ایمان کس کام کا؟ نیز مسلمان ریاست کے حکام کے پاس وہ کونسی روشن دلیل ہو سکتی ہے جس کی بنا پر وہ مرتد کو قتل کریں گے؟

بخلاف اس کے انگریزی راج میں ہر مذہب کے پیروؤں کو تبلیغ کی آزادی ہے اور ایک قادیانی تک ۱۹۰۸ء اور ۱۹۳۰ء کے سرکاری اعلان کے ماتحت عین لندن میں اپنے "مسیح موعود" یا بروزی نبی کی دعوت پھیلا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک مومن دین الٰہی کی تبلیغ انگریزی شاہی خاندان تک میں کر سکتا ہے اور ان دونوں کی جان کی حفاظت پھر بھی گورنمنٹ پر واجب ہوگی۔ کیا اسلامی ریاست میں بھی ایک قادیانی اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکے گا اور اس کی جان کی حفاظت اسلامی حکومت کرے گی؟

جواب:۔ قتل مرتد کے حکم پر لوگوں کو جو اعتراض ہے وہ درحقیقت نتیجہ ہے اس اختلاف کا جو ہم میں اور دوسروں میں نفس دین کے بارے میں ہے۔ ہمارے ہاں دین زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ عبادت، ریاست، معیشت، کوئی چیز دین سے باہر نہیں ہے۔ اور دوسروں کے یہاں دین محض پرائیویٹ زندگی تک محدود ہے جو چند رسموں اور چند "عبادتوں" پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے دوسروں کو اس بات میں کوئی زحمت نہیں ہے کہ جب چاہے کوئی شخص ان کے دین سے باہر نکل جائے، بشرطیکہ ان کے قانون سیاسی و اجتماعی (یعنی ریاستی دین) کا وفادار رہے۔ اسی طرح اس میں بھی ان کے لیے کوئی زحمت نہیں ہے کہ باہر سے اگر جو شخص چاہے ان کے ہاں اپنے دین کی اشاعت کرے، بشرطیکہ اس کا دین بھی ان کے دین کی طرح پرائیویٹ زندگی تک محدود ہو۔ وہاں نظام اجتماعی زندگی ریاستی قانون (یعنی دین ریاست) کے ماتحت ہے جس نے تدریجاً دین خدا پرستی کو شکست دے کر اور اسے انفرادی زندگی کے دائرے میں محدود کر کے اس کی جگہ لے لی ہے اور اسی

وجہ سے اب سارا زور اس کی وفاداری پر صرف کیا جاتا ہے اور اسے گوارا نہیں کیا جاتا کہ کوئی شخص اس ریاستی دینی نظام قانون کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکے یا اس کے خلاف بغاوت برپا کرنے اور کسی دوسرے نظام کے قائم کرنے کے لیے تبلیغ کرے۔

ہمارے ہاں شخصی دین اور ریاستی دین الگ الگ نہیں ہے۔ ایک ہی دین ہے جس کا اتباع انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں میں مطلوب ہے۔ پس ہمارے ہاں اگر کوئی شخص دین سے نکلنے کا اعلان کرتا ہے تو وہ صرف اپنی شخصی زندگی ہی نہیں بدلتا بلکہ ہمارے ریاستی نظام سے بغاوت کرتا ہے اور ملک میں فساد برپا کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص باہر سے آکر اپنے دین کی تبلیغ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمارے اندر آکر ہمارے نظام اجتماعی کے خلاف ہمارے لوگوں کو بغاوت کی دعوت دیتا ہے۔ ان چیزوں کو دنیا کی کوئی ریاست گوارا نہیں کر سکتی۔ انگریز جن کی رواداری کا آپ نے حوالہ دیا ہے، کیا اس بات کو گوارا کرتے ہیں کہ ان کے ملک میں جا کر آپ ان کے نظام کو الٹنے کی دعوت دیتے پھرتے ہوں؟ بے شبہ انھیں اس بات پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ ایک قادیانی مشن ان کے ملک میں جا کر اپنے غیر سیاسی دین کی دعوت دے، لیکن کیا وہ ایک مسلم مشن کو بھی گوارا کر سکتے ہیں جو وہاں جا کر یہ دعوت دے کہ بادشاہ حقیقی صرف خدا ہے اور اسی کا قانون ماننا چاہیے اور اس کے قانون کے سوا سارے قانون باطل ہیں اور جو لوگ اللہ کے قانون کے سوا کسی اور قانون کی برضا و رغبت اطاعت کرتے ہیں وہ مشرک ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی رواداری کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

جبراً مسلمان بنانے کا بھی یہاں سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں اتمام حجت اور وضاحت حق کے بعد کسی شخص کو ضلالت پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چنانچہ جن قوموں میں خدا نے کسی نبی کو بھیجا اور نبی نے پورے طور پر ان پر حق واضح کر دیا، ان کے منکرین کو خدا نے ہلاک کر دیا، صرف مومنین کو باقی رکھا اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری کریں اور جن لوگوں نے نبی کے دین کو قبول نہیں کیا ہے انھیں اپنی اطاعت پر مجبور کریں، تاکہ اگر ان میں کچھ صلاحیت ہو تو وہ ان کے ماتحت رہ کر دین حق کو قبول کریں، ورنہ کم از کم خدا کی زمین ان کے فساد سے مامون رہے۔ یہ الاؤنس کہ ان کو جینے کا موقع مل گیا، اس وجہ سے دیا جاتا ہے کہ نبی کی بعثت ان کی طرف براہ راست نہیں ہوئی، بلکہ بالواسطہ ہوئی ہے، جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غیر بنی اسمٰعیل تھے جن کو ذمی بنا لیا گیا۔ باقی رہے وہ لوگ جن کی طرف نبی کی بعثت براہ راست ہوتی ہے، چونکہ ان پر اتمام حجت ممکن حد تک ہو چکا ہے اس وجہ سے ان کے لیے صرف دو صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ یا تو اسلام لائیں یا تلوار قبول کریں۔ چنانچہ بنی اسمٰعیل کے منکرین کے ساتھ یہی ہوا۔

اس اصول کے ماتحت اب ان لوگوں کے مسئلہ پر غور کیجیے جو مسلمانوں کے اندر سے خدا کے قانون سے بغاوت کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں میں داخل نہیں ہو سکتے جن کی طرف نبی کی بعثت براہ راست نہیں ہوئی ہے کہ ذمیوں میں شمار ہو سکیں، لازماً ان لوگوں میں شمار ہوں گے جن پر حق واضح ہو چکا ہے یا جن کے لیے وضاحت حق کے لیے تمام وسائل موجود ہیں، کیونکہ وہ مسلمان ہو کر مسلمانوں کے اندر رہ چکے ہیں۔ اب اگر وہ خدا کے قانون سے بغاوت کرتے ہیں تو آخر خدا کا قانون ان کو کس غرض کے لیے جینے کی مہلت دے گا؟ اب ان کی ہدایت کے لیے کس چیز کا انتظار باقی ہے؟ ان لوگوں کو سورہ مائدہ کی آیت

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ" کی رو سے امام قتل کر دینے کا مجاز ہے۔

نظامِ حق کے نفاذ میں تلوار کا حصہ

سوال:- میں نے آپ کی کتاب "جہاد فی سبیل اللہ" پڑھی۔ اس میں آپ نے لکھا ہے کہ "تلوار کے زور سے پرانے ظالمانہ نظامِ زندگی کو بدل دینا اور نیا عادلانہ نظام مرتب کرنا بھی جہاد ہے"۔ اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ قرآن کریم میں جس جہاد پر زور دیا گیا ہے وہ تو یہ ہے کہ "فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا" (فرقان) یعنی کافروں کی بات نہ مان اور اس قرآن کے ذریعے کفار کے ساتھ بہت بڑا جہاد کر۔

ورنہ کیا نعوذ باللہ قرآن مجید میں کوئی ذاتی جوہر نہیں ہے کہ لوگوں کے دل تلوار چلائے بغیر فتح نہ کیے جا سکیں؟ اسلام تو مذہب کے متعلق آزادی دیتا ہے کہ "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (بقرہ) یعنی دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہونا چاہیے"۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو جبر سے نہیں پھیلایا اور تلوار صرف مدافعت کے لیے اٹھائی نہ کہ تبلیغ کے لیے، کیونکہ کفار کی طرف سے جنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ دینی جنگ کرنے کی اجازت صرف ان لوگوں کے مقابلہ میں ہے جو دین کے نام سے مسلمانوں سے جنگ کریں، مگر اس میں بھی زیادتی کی اجازت نہیں۔ "وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ"۔ (اور دین کی لڑائی ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر یہ خیال رکھو کہ زیادتی نہ کر بیٹھو، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ کی رائے میں اس وقت ہندوستان کا نظامِ زندگی ظالمانہ ہے؟ اور جن شرائط کے ماتحت اسلام نے جہاد بالسیف کو فرض قرار دیا ہے، وہ ہندوستان میں پیدا ہو گئے ہیں یا نہیں؟

جواب:- آپ کا خط غلطیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے قرآن شریف پر بحیثیت مجموعی نہیں غور کیا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جتنی آیتیں بھی آپ نے پیش کی ہیں ان میں سے کسی کا بھی صحیح محل آپ نے نہیں سمجھا ہے۔ آیت "فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھادا کبیرا" کا تعلق ان کفار سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حسی معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کی نسبت فرمایا گیا ہے کہ ان کافروں کی بات پر دھیان نہ کرو اور ان کے ساتھ اس قرآن کے ذریعہ جہاد کرو، اگر ان کا کفر ٹوٹنا ہے تو اسی قرآن سے ٹوٹے گا، ورنہ معجزات سے ان کو کوئی نفع نہ پہنچے گا۔ ہاں تم اپنی طرف سے اس قرآن کی تبلیغ و تفہیم میں کوئی کسر نہ چھوڑو۔

جہاد کے واجب کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن مجید میں کوئی ذاتی جوہر نہیں ہے۔ قرآن مجید میں لاکھ جوہر سہی، لیکن وہاں یہ جوہر کیا کام دے سکتا ہے جہاں سینوں میں دلوں کی جگہ پتھر ہوں۔ جن قلوب میں کچھ صلاحیت ہوتی ہے قرآن ان کو ترجیح، لیکن

رکھی۔ جب تک آپ کے ساتھ کوئی جمعیت نہیں تھی، آپ اور آپ کے تھوڑے سے صحابہ کفار کے ہاتھوں ہر طرح کے مظالم جھیلتے رہے۔ مگر جب آپ کے ساتھ کچھ جمعیت ہو گئی، آپ نے کفار کے حملوں کو روکا اور تلوار کا جواب تلوار سے دیا۔ اس بیچ میں اگر آپ کو ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے کفار سے صلح کے معاہدے بھی کیے، اور اگر ضرورت ہوئی تو جنگ بھی کی۔ آخر کار قرآن کی سورہ براءۃ میں یہ فرمان نازل ہو گیا کہ کفار کی جن جماعتوں نے اپنے معاہدے توڑے ہیں ان کے معاہدوں کے خاتمہ کا اعلان کر دیا جائے اور اشہر حرم کے ختم ہونے پر وہ جہاں پائے جائیں قتل کیے جائیں، اور جب تک وہ توبہ نہ کریں، نماز نہ قائم کریں، زکوٰۃ نہ دیں اس وقت تک ان کو امان نہ دی جائے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (۵۔ توبہ)

پھر جب گذر چکیں پناہ کے مہینے تو قتل کر ڈالو مشرکوں کو جہاں پاؤ اور ان کو پکڑو اور گھیرو اور ان کی تاک میں بیٹھو ہر کمین گاہ میں پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور قائم کریں نماز اور دیا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ

اور جن جماعتوں نے معاہدے نہیں توڑے ہیں ان کے معاہدے ان کی مدت کے بعد ختم کر دیے جائیں اور ان سے جنگ کی جائے:۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ (۴۔ توبہ)

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کر رکھا تھا، پھر انھوں نے تمھارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ مدد کی تمھارے مقابلہ میں کسی کی تو ان سے پورے کرو ان کے عہد ان کی مدت تک۔

اسی طرح مشرکین کے علاوہ اہل کتاب کے متعلق بھی آخری اعلان یہ کر دیا گیا کہ ان سے اس وقت تک جنگ کی جائے کہ وہ جزیہ دینے کی ذلت پر راضی ہوں:۔

وَقَاتِلُوا الَّذِيْنَ .... مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝

لڑو ان لوگوں سے .... وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر۔

ان صریح اعلانات کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے صرف مدافعت کے طور پر تلوار اٹھانے کی اجازت دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بلاشبہ صورت حالات یہی ہے کہ ہر جنگ کے اسباب کفار ہی نے مہیا کیے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اہل مکہ اگر نزول براءۃ کے بعد بھی کوئی معاہدہ کرنا چاہتے تو ان سے معاہدہ ہو سکتا یا اہل کتاب اگر فتنے نہ اٹھاتے تو ان سے جنگ اور جزیہ کی نوبت نہ آتی۔ کفر اور کافرانہ نظام زندگی کا وجود خود ایک مستقل سبب جہاد ہے اور جب تک یہ دنیا میں باقی ہیں اس وقت تک اگر شرائط و حالات بہم ہوں تو مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ چین کی نیند سوئیں۔ چنانچہ حضرات خلفائے راشدین نے، جنھوں نے قرآن اور پیغمبر کی تعلیم کو سب سے بہتر سمجھا تھا، اسی پر عمل کیا اور اپنے اپنے زمانوں میں برابر جہاد بالسیف کو دنیا میں عدل و قسط قائم کرنے کے لیے جاری رکھا، البتہ

مشرکین عرب کے علاوہ دوسری قوموں کے لیے جو اہل کتاب میں یا اہل کتاب کے حکم میں داخل تھیں اسلام اور تلوار کے سوا ایک تیسری راہ جزیہ کی ادائیگی کے ساتھ اطاعت کی بھی کھلی رکھی گئی تھی۔ اس لیے صحابہ نے ان قوموں سے جزیہ لے کر ان کو مطیع بنا لیا، تاکہ نبی کی بعثت ان کی طرف براہ راست نہ ہونے کی وجہ سے انھیں جو الاؤنس ملنا چاہیے وہ بھی مل جائے اور دنیا ان کے فساد سے محفوظ بھی ہو جائے۔ باقی وہ جنگ کرتے یا نہ کرتے، خلفائے راشدین از روئے قرآن مامور تھے کہ ان سے جنگ کریں اور ان کے ہاتھوں سے طاقت چھین کر ان کو مغلوب و مطیع کر لیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے صرف مدافعت کے لیے تلوار اٹھائی وہ درحقیقت صحابہ کے غزوات کو ملوکانہ جنگوں کی حیثیت دیتے ہیں، حالانکہ یہ قرآن کے احکام کا صریح انکار اور حضرات خلفائے راشدین پر سخت ترین طعن ہے۔ یہ تمام غزوات قیام قسط کے لیے تھے جس پر یہ امت مامور ہے۔

بقرہ کی آیت "وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" کا مطلب بھی آپ نے نہیں سمجھا ہے۔ یہ آیت اور اس کے بعد کی آیات ان مسلمانوں کے شبہات کو دور کر رہی ہیں جن پر اشہر حرم اور بلد حرام کا احترام اس قدر غالب تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ان مہینوں اور اس مقام میں کفار حملہ بھی کر دیں تو ان کا دفاع نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن نے ان کو بتایا کہ جو لوگ تم سے اشہر حرم اور بلد حرام میں لڑیں ان سے لڑو اور یہاں تک لڑو کہ "لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ" یعنی فتنہ (Persecution) کلیۃً ختم ہو جائے اور خدا کی زمین پر صرف خدا کا دین جاری و نافذ ہو جائے۔ اور اشہر حرم میں جنگ کی اس اجازت کی وجہ یہ بتائی کہ یہ تو درحقیقت اشہر حرم اور بلد حرام کی بے حرمتی کا قصاص ہے۔ انھوں نے تمھیں اس مقدس سرزمین اور ان مقدس مہینوں کے امان سے محروم کیا ہے، اس لیے تمھیں پورا حق ہے کہ تم بھی ان کے امان سے ان کو محروم کر دو۔ البتہ اگر وہ ان مہینوں اور اس شہر میں تم پر حملہ نہ کریں تو تم اپنی طرف سے ان کی حرمت برباد کرنے کے لیے پہل نہ کرو۔

سوال کے دوسرے جز کے سلسلہ میں، سمجھ لیجیے کہ ہندوستان کا نظام زندگی بالکل کافرانہ اور ظالمانہ ہے لیکن وہ شرائط یہاں ابھی پورے نہیں ہیں جن کے ماتحت اسلام نے جہاد بالسیف کی اجازت دی ہے۔ جہاد بالسیف کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ وہ "بااختیار" امیر کی قیادت میں ہو۔ کسی دوسرے نظام قاہر و مسلط کے اندر رہتے ہوئے جہاں کسی بااختیار امیر کا وجود ناممکن ہے، قتال کرنا بدامنی اور فساد ہے جو جائز نہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال کا اعلان ہجرت کے بعد فرمایا۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ جہاد بالسیف کے لیے اٹھیں وہ خود شائبہ فساد و ظلم سے پاک ہو چکے ہوں کیونکہ جہاد زمین کے فساد کو مٹانے کے لیے ہے اور کسی ایسی جماعت کا جہاد کے لیے اٹھنا بالکل مہمل بات ہے جو خود فساد میں مبتلا ہو۔ اس طرح کی کوئی جماعت اور کوئی بااختیار امیر چونکہ ابھی ہندوستان میں موجود نہیں۔ ہے اس وجہ سے یہاں جہاد بالسیف روا نہیں۔

ہندوستان میں قضا شرعی کا قضیہ

سوال:۔ "اہم استفتاء" کو دیکھ لینے کے بعد "حقوق الزوجین" کی بعض عبارتیں بہت کھٹک رہی ہیں۔ اسی سلسلہ میں توضیح مدعا کی ضرورت ہے۔ مثلاً آپ نے لکھا ہے کہ:۔

"ہندوستانی مسلمانوں کو اس میں تہذیبی خود اختیاری حاصل ہو جس کے تحت مسلمان اپنے محاکم شرعیہ قائم کرنے کے مجاز ہوں۔" (حقوق الزوجین ص ۹۳)

یہ مطلوب طاغوتی نظام ہی کی نوازش سے حاصل ہوگا نا؟ اور یہ محاکم اپنے احکام کے اجرا کے لیے طاقت بھی تو طاغوت ہی سے لیں گے۔ پھر کیا اس پر اسلام مطمئن ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:-

"اگر یہ چیز بھی حاصل نہ ہو تو "بر سبیل تنزل" اتنا ہی سہی، اور یہ بھی انتہائی مجبوری کی حالت میں آخری صورت ہو کہ مذہب مالکی کے مطابق ہر ضلع میں تین مسلمانوں کی ایک پنچایت مقرر کی جائے۔" (ایضاً ص ۹۳ و ص ۹۴)

یہ پنچایت کمیٹی جو نظام باطل کے اذن و اجازت سے اور باطل کے زیر سایہ قائم ہوگی، کیا حق تعالیٰ کو بھی منظور ہوگی؟

دراصل یہ لفظ "تنزل" اپنے مفہوم سمیت ایک جاہلی اصطلاح ہے۔ تنزل ہی کرتے کرتے مسلمان کفر کی سرحد میں داخل ہو کر بھی کٹر مسلمان بنے ہوئے ہیں۔ پھر آگے یہ الفاظ نظر آتے ہیں:-

"حکومت متسلطہ پر دباؤ ڈال کر اس سے پنچایتی نظام کو تسلیم کرا لیا جائے۔" (ایضاً ص ۹۴)

اللہ اکبر! سارے عالم سے طاغوت کو بے دخل کرنے والا "مسلم" نظام پنچایتی پر قانع ہو جائے اور لطف بر جراحت یہ کہ اس نظام کا قیام بھی طاغوت کی منظوری کا محتاج ہو! "حکومت متسلطہ پر دباؤ" بھی کیا وہ مسلمان ڈالیں گے جو اس طاغوتی نظام پر بالکل راضی ہیں اور اسلام کا جوا اتارنے کی فکر میں ہیں۔ پھر دباؤ ڈالنے کا ہی عزم ہے تو آدھے پونے اسلام کی منظوری تک کیوں محدود ہے؟ کیوں نہیں کامل اسلام کے کامل غلبہ کی کوشش کا مشورہ دیا گیا؟

ایسے ہی اور بہت سے مقامات نظر سے گزرے ہیں جو اہم استفتا کے مباحث کی ضد ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- آپ نے جن جذبات دینی کے ماتحت گرامی نامہ تحریر فرمایا ہے اور نظام باطل سے ہر قسم کے تعلق سے جس طرح براءت کا اظہار کیا ہے اس سے دلی مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کے دل میں یہی جذبات پیدا کرے۔ حقوق الزوجین میں اس قسم کی تجویزیں جو بر سبیل تنزل لکھی گئی ہیں جماعت اسلامی کے مسلک کی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ ان جماعتوں کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی ہیں جو موجودہ نظام کے تحت اپنی مذہبی مشکلات کے حل کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ اس بات کی تصریح بھی نہایت واضح الفاظ میں کر دی گئی ہے۔ تعجب ہے کہ اس کے باوجود آپ کو یہ شبہات کیوں لاحق ہوئے۔ بعد میں ایک رفیق کے سوال کے جواب میں ترجمان القرآن کے صفحات میں بھی اس بات کی وضاحت ہو چکی ہے۔ بہر حال جماعت اسلامی کا طرز عمل بالکل غیر مشتبہ ہے اور اس طرح کے شکوک کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

فقہا و ائمہ سے انتساب مسلک

سوال:- "ان الدین عند اللہ الاسلام" کی آپ نے جو تشریح فرمائی ہے اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کسی فقیہ یا مجتہد سے اخذ کردہ مسائل اسلام پر اس فہم کے ساتھ عمل کر رہا ہو کہ وہ مسائل اس فقیہ کی رائے

اور اس کا مذہب ہیں تو اس کا یہ فہم اور عمل دونوں گمراہی ہیں۔ اسے تو اس فہم و ادراک کے ساتھ عمل کرنا چاہیے کہ یہ مسائل اس فقیہہ یا مجتہد کے خانہ ساز مسائل اور ان کے خود ساختہ مذہب نہیں، بلکہ وہ خاص اسلام کے مسائل ہیں جن کا علم اسے اس فقیہہ یا مجتہد کی وساطت اور ذریعے سے حاصل ہوا۔ کسی فقیہہ یا مجتہد سے حاصل شدہ مسئلہ اسلام کو یہ حیثیت دے کر عمل کرنا کہ یہ مسئلہ اس فقیہہ یا مجتہد کا مسئلہ اور اس کا مذہب ہے، پہلی بڑی ضلالت ہے اور ضلالۃ فوق ضلالۃ یہ ہے کہ اپنے عمل اور اپنے اس اتباع کو اس فقیہہ و مجتہد کی طرف منسوب بھی کر دیا جائے۔ شارع علیہ السلام کے علاوہ کسی اور کی طرف، کسے باشد، انتساب ہی غلط ہے۔ جس مسئلہ پر عمل ہو اس فہم و شعور کے ساتھ ہو کہ یہ مسئلہ اسلام کا مسئلہ ہے اور اس عمل میں ہم اتباع اسلام کر رہے ہیں۔

نیز یہ کہنا کہ میں اس مسئلہ میں فلاں فقیہہ کا پیرو ہوں اور یہ کہ اس بارے میں فلاں مجتہد صاحب کا مذہب میرا اصول ہے اور کسی کا یہ طے کر دینا کہ ایک دو یا چند ایک بزرگان متقدمین کے مذاہب میں سے کسی ایک کی پیروی لازمی ہے، میرے خیال میں بوجوہ مذکورہ درست نہیں۔

میں نے اپنی سمجھ کے مطابق حقوق الزوجین اور رسالہ دینیات میں ایسے مقامات دیکھے ہیں جہاں مسائل کے افراد دران کے بیان میں "مذاہب" کے ذکر اور ان کی طرف انتساب کو نمایاں دخل ہے۔ یعنی "یہ مسئلہ فلاں مذہب کا ہے" اور "فلاں مذہب کا یہ مسئلہ درست نہیں" اور "فلاں مذہب کے مطابق عمل درست ہوگا" وغیرہ نہ ہونا یوں چاہیے کہ "یہ مسئلہ اسلام کا ہے" اور "یہ مسئلہ اسلام کا نہیں، اس لیے درست نہیں" اور "اسلام ہی کے فلاں مسئلہ پر عمل درست ہوگا" وغیرہ!

اگر ان شبہات میں میں حق بجانب نہیں ہوں تو میری غلط فہمی کا ازالہ فرما دیں۔

جواب:۔ کسی اجتہادی مسئلہ کو عین دین اسلام کہہ کر پیش کرنا یا اس پر عین شریعت اسلام سمجھ کر عمل کرنا غلط ہے۔ جس معاملہ میں نصوص شریعت موجود نہ ہوں اس میں ایک مجتہد اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات سے اوفق بات معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جس نتیجہ پر بھی وہ پہنچتا ہے یہ اس کی اپنی رائے ہوتی ہے، جس میں خطا اور صواب دونوں کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی رائے کو عین اسلام کہہ کر پیش کرے۔ وہ صرف یہی کہہ کر پیش کر سکتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اس کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول کی مرضی سے اقرب بات یہ معلوم ہوتی ہے۔ صحابہ کرام اور ائمہ عظام تمام اجتہادی امور میں اسی طرح اپنی رائیں پیش کیا کرتے تھے، کوئی بھی یہ کہہ کر پیش نہیں کرتا تھا کہ اللہ نے یہ فرمایا ہے یا رسول کا یہ ارشاد ہے یا شریعت اسلام کا یہ حکم ہے۔

جو لوگ ان اجتہادات کو قبول کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں مسئلہ میں میں فلاں امام کا پیرو ہوں ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں اس امام کے اجتہاد کو اوفق بالکتاب والسنۃ پاتا ہوں اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ قباحت جس چیز میں ہے وہ صرف یہ ہے کہ آدمی کسی ایک امام یا عالم کا اندھا مقلد بن جائے اور حق و ہدایت کو اس کی پیروی کے اندر محصور کر دے۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ آپ بھی یہی کہنا چاہتے ہیں، لیکن تعبیر میں بات خلط ملط ہو گئی۔

قرآن و حدیث اور سائنٹفک حقائق

سوال:۔ قرآن و حدیث میں بہت سے امور ایسے بیان ہوئے ہیں جنھیں زمانۂ حال کی تحقیق غلط قرار دیتی ہے۔ اس صورت میں

ہم قرآن وحدیث کو مانیں یا علمی تحقیق کو؟ مثلاً :-

ا - قرآن کہتا ہے کہ نوعِ انسانی آدمؑ سے پیدا ہوئی۔ بخلاف اس کے علمائے دورِ حاضر کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کے کنبہ سے تعلق رکھتا ہے اور بندروں اور بن مانسوں سے ترقی کرتے کرتے آدمی بنا ہے۔

ب - قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ آفتاب حرکت کرتا ہے مگر سائنس کہتی ہے کہ نہیں آفتاب ساکن ہے۔

ج - اسی طرح بادلوں میں جو کڑک اور چمک ہوتی ہے، اس کے متعلق اسلام کی رائے یہ ہے کہ یہ بادلوں کو ہنکاتے ہوئے فرشتوں کے کوڑے پٹکنے اور آواز نکالتے ہیں، حالانکہ زمانۂ حال کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ رعد اور برق کا ظہور بادلوں کے ٹکرانے سے ہوتا ہے۔

د - "کانا دجال" کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں مقید ہے تو آخر وہ کونسی جگہ ہے۔ آج تو دنیا کا کونہ کونہ انسان نے چھان مارا ہے، پھر کیوں کانے دجال کا پتہ نہیں چلتا؟

جواب :- مجھے تو اپنی پچیس سالہ علمی تحقیق وتفتیش کے دوران میں آج تک ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی ہے کہ سائنٹفک طریقہ سے انسان نے کوئی حقیقت ایسی دریافت کی ہو جو قرآن کے خلاف ہو۔ البتہ سائنٹسٹوں یا فلسفیوں نے قیاس سے جو نظریے قائم کیے ہیں ان میں سے متعدد ایسے ہیں جو قرآن کے بیانات سے ٹکراتے ہیں۔ لیکن قیاسی نظریات کی تاریخ خود اس بات پر شاہد ہے کہ ایک وقت جن نظریات کو حقیقت سمجھ کر ان پر ایمان لایا گیا دوسرے وقت خود وہی نظریات ٹوٹ گئے اور آدمی ان کے بجائے کسی دوسری چیز کو حقیقت سمجھنے لگا۔ ایسی ناپائیدار چیزوں کو ہم یہ مرتبہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ قرآن کے بیانات سے ان کی پہلی ٹکر ہوتے ہی قرآن کو چھوڑ کر ان پر ایمان لے آئیں۔ ہمارا ایمان اگر متزلزل ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ کسی ثابت شدہ حقیقت سے، یعنی ایسی چیز سے جو تجربہ و مشاہدہ سے مبرہن ہو چکی ہو، قرآن کا کوئی بیان غلط قرار پائے، مگر جیسا کہ اوپر میں لکھ چکا ہوں، ایسی کوئی چیز آج تک میرے علم میں نہیں آئی ہے۔ اب فرداً فرداً ان چیزوں کے متعلق کچھ عرض کروں جنھیں آپ نے مثال میں پیش کیا ہے :-

ا - ڈارون کا نظریۂ ارتقا، اس وقت تک محض نظریہ ہے، ثابت شدہ حقیقت نہیں۔ علی گڑھ ایک علمی مرکز ہے جہاں اس نظریہ پر ایمان لانے والوں کی اچھی خاصی تعداد آپ کو ملے گی، آپ خود انہی سے پوچھ لیجیے کہ یہ نظریہ (Theory) ہے یا واقعہ (Fact)؟ اگر ان میں سے کوئی صاحب اسے واقعہ قرار دیں تو ذرا ان کا اسم گرامی مجھے بھی لکھ دیجیے۔

ب - علی گڑھ میں فلکیات (Astronomy) جاننے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ذرا ان لوگوں سے پوچھیے کہ کیا واقعی آفتاب ساکن ہے؟ اگر ایسے کوئی صاحب مل سکیں تو ان کے نام نامی سے بھی علمی دنیا کو ضرور مطلع کرنا چاہیے۔ غالباً آپ ابھی تک انیسویں صدی کی سائنس کو سائنس سمجھ رہے ہیں جبکہ آفتاب متحرک نہ تھا۔ موجودہ سائنس کا آفتاب تو اچھی خاصی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔

ج - قرآن مجید کی کوئی آیت میرے علم میں ایسی نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ بادلوں میں چمک اور کڑک بجلی کے بجائے فرشتوں کے کوڑے برسانے سے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں بارش کا جو عمل (Process) بیان

کیا گیا ہے وہ بالکل ٹھیک ٹھیک موجودہ زمانہ کی سائنٹفک تحقیقات کے مطابق ہے اور اتنا جدید (up to date) ہے کہ پچھلی صدی کے وسط تک جو معلومات انسان کے پاس بارش کے متعلق تھیں ان کی بنا پر بعض لوگوں کو ان آیات کی تفسیر میں سخت پریشانی پیش آتی تھی جن میں بارش کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

د۔ یہ "کانا دجال" وغیرہ تو افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ ان چیزوں کو تلاش کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت بھی نہیں۔ عوام میں اس قسم کی جو باتیں مشہور ہیں، ان کی کوئی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے، اور ان میں سے کوئی چیز اگر غلط ثابت ہو جائے تو اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

ہمہ گیر اسٹیٹ میں تحریک اسلامی کا طریق کار

سوال:۔ یہ بات تو اب کسی مزید استدلال کی محتاج نہیں رہی کہ ایک مسلمان کے لیے، بشرطیکہ وہ اسلام کا صحیح شعور حاصل کر چکا ہو، صرف ایک ہی چیز "مقصد زندگی" قرار پا سکتی ہے اور وہ ہے حکومت الٰہیہ کا قیام۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے صرف وہی طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے جو اس کی فطرت سے عقلاً مناسبت رکھتا ہو اور جو اس کے اصلی داعیوں نے عملاً ہمیشہ اختیار کیا ہو۔ حکومت الٰہی کے نصب العین کے داعی انبیاء کرام ہیں۔ اس لیے طریق کار بھی وہی صحیح ہے جو انبیاء کا طریق کار ہو۔ انبیاء کی زندگیوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں فی الجملہ دو قسم کے پیغمبر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کی دعوت کے ظہور کے وقت اسٹیٹ ایک موثر اور منظم طاقت کی حیثیت سے سوسائٹی میں کارفرما نظر آتا ہے اور اکثر حالات میں وہ ایسا اسٹیٹ ہوتا ہے جس میں اقتدار اعلیٰ کلی طور پر شخص واحد میں مرکوز ہوتا ہے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ دوسرے وہ جن کو واسطہ ایک ایسی سوسائٹی سے پڑتا ہے جس میں اسٹیٹ ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا اور زیادہ سے زیادہ "سرقبیلی" (Patriarchical) قسم کا اسٹیٹ تھا، جیسے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔ چنانچہ دونوں صورتوں میں طریق کار کا اختلاف نمایاں ہے جو غالباً اسی سیاسی اختلاف احوال کا نتیجہ ہے۔

لیکن جتنی جامعیت، اور ہمہ گیری اسٹیٹ نے اب حاصل کر لی ہے اور جس طرح اس نے آجکل فرد کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، اور جس قدر منظم، موثر اور مضبوط طاقت فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس نے اب اختیار کر لی ہے اس کی مثال شاید پچھلی تاریخ میں نہ مل سکے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہی طریق کار جو تقریباً غیر ریاستی (Stateless) سوسائٹی یا حد سے حد "سرقبیلی حکومت" (Patriarchical) والی سوسائٹی میں کامیاب طور پر استعمال کیا گیا تھا، اب بھی اس قسم کی کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے؟ کیا آجکل کے بدلے ہوئے حالات میں اسی مقصد کے لیے کام کرنے والی پارٹی کو اپنا فن انقلاب انگیزی (Technique) کافی حد تک نہیں بدلنا پڑے گا؟

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کے برعکس حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا۔ چنانچہ انہوں نے جب قوت تسلط (sovereign power) کو اقتدار منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو فوراً "اجعلنی علیٰ خزائن الارض" کہہ کر اقتدار سنبھال لیا اور اس طرح اپنا مشن پورا

کرنے کے لیے پہلے کے قائم شدہ اسٹیٹ کو استعمال میں لے آئے۔ موجودہ زمانہ کا اسٹیٹ حضرت یوسف علیہ السلام کے عہد کے اسٹیٹ سے کہیں زیادہ جامع، ہمہ گیر اور منظم ہے۔ اس کو اکھیڑ کر ایک نیا اسٹیٹ وجود میں لانے کے لیے جو انقلاب بھی ہوگا اس کا راستہ خون کے لالہ زاروں سے ہو کر گذرے گا، جیسا کہ بالشویک روس میں ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام محض توڑ پھوڑ قسم کا انقلاب نہیں چاہتا ہے۔ بلکہ اس کا پروگرام کچھ زیادہ نازک ہے۔ ان حالات میں تو زیادہ موزوں طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے کلی انقلاب کے جتنا کچھ اقتدار حاصل ہو سکے اسے قبول کر کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ اگر اس پوزیشن کو قبول کر لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ملک کی موجودہ مسلمان جماعتوں کے خلاف کوئی کارروائی درست نہیں ہوگی بلکہ تائید بھی ضروری ہو جائیگی

یہ بات واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اقتدار سے مراد سول سروس کے مناصب نہیں، جیسا کہ کسی نواب صاحب نے ترجمان کی ایک اشاعت میں یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں فرمایا ہے، بلکہ ایک منظم جماعت کا جد وجہد کے بعد جماعتی حیثیت سے قوتِ حاکمہ (sovereign power) سے اختیارات لے کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا مراد ہے۔

جواب:۔ بلاشبہہ ایسی حالت میں جبکہ اسٹیٹ ہمہ گیر ہو اُس حالت کی بہ نسبت جبکہ سماجی نظام بالکل ابتدائی نوعیت کا ہو، بہت کچھ فرق واقع ہو جاتا ہے اور اس کے لحاظ سے طریق کار میں بھی کم از کم صورت کے لحاظ سے تغیر کرنا ضروری ہے، لیکن اصولی حیثیت سے طریق کار میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت پر لبیک کہیں، منظم کرتے جائیں گے، پھر اگر رائے عام کی موافقت سے یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلہ پر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آجانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام کو اپنے اصول پر ڈھال سکیں گے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہ ہوگا، اس لیے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے، اپنے مقصد سے ہے، نہ کہ کسی خاص طریق کار (Method) سے۔ لیکن اگر پر امن ذرائع سے جوہر اقتدار (substance of Power) ملنے کی کوئی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام انقلابی دعوت جاری رکھیں گے اور تمام مشروع ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔

موجودہ سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی کا مسلک

سوال:۔ اس وقت مسلمانان ہند دو فتنوں میں مبتلا ہیں۔ اول کانگریس کی وطنی تحریک کا فتنہ جو واحد قومیت کے مفروضے اور مغربی ڈیموکریسی کے اصول پر ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے۔ دوم مسلم نیشنلزم کی تحریک جسے مسلم لیگ چلا رہی ہے اور جس پر ظاہر میں تو اسلام کا لیبل لگا ہوا ہے مگر باطن میں روح اسلامی سراسر مفقود ہے۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے مطالعہ سے یہ بات ہم پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ دونوں تحریکیں اسلام کے خلاف ہیں لیکن حدیث میں آیا ہے کہ انسان جب دو بلاؤں میں مبتلا ہو تو چھوٹی بلا کو قبول کرے۔ اب کانگریس کی تحریک تو سراسر کفر ہے، اس کا ساتھ دینا مسلمانوں کی موت کے مرادف ہے۔ اس کے مقابلہ میں لیگ کی تحریک، اگرچہ غیر اسلامی ہے، لیکن اس سے یہ خطرہ تو نہیں ہے کہ دس کروڑ مسلمانان ہند کی قومی ہستی ختم ہو جائے۔ لہٰذا کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیگ سے باہر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ہمدردی کریں؟ اس وقت ہندوستان میں انتخابات کی مہم درپیش ہے اور یہ

انتخابات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف تمام غیر لیگی عناصر مل کر مسلم لیگ کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ کانگریس کی وطنی تحریک مسلمانوں پر زبردستی مسلط ہو کے رہ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور وہ اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان دونوں کا فیصلہ رائے دہندوں کے ووٹ پر منحصر ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیا ہم لیگ کے حق میں ووٹ دیں اور دلوائیں؟ یا خاموش بیٹھے رہیں؟ یا خود اپنے نمائندے کھڑے کریں؟

جواب:۔ آپ کے ذہن پر ملک کے موجودہ سیاسی حالات کا غلبہ ہے اس لیے آپ کو صرف دو ہی فتنے نظر آئے جن میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں، حالانکہ اگر آپ ذرا وسیع نگاہ سے دیکھتے تو ان دو فتنوں کے علاوہ آپ کو اور بہت سے اخلاقی، فکری، تمدنی، مذہبی اور سیاسی و معاشی فتنے نظر آتے جو اس وقت مسلمانوں پر ہجوم کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ ایک فطری سزا ہے جو اللہ کی طرف سے ہر اس قوم کو ملا کرتی ہے جو کتاب اللہ کی حامل ہونے کے باوجود اس کے اتباع سے منہ موڑے اور اس کے منشا کے مطابق کام کرنے سے جی چرائے۔ اس سزا سے اگر مسلمان کبھی بچ سکتے ہیں تو وہ صرف اس طرح کہ اپنے اس اصلی و بنیادی جرم سے باز آجائیں جس کی پاداش میں ان پر یہ فتنے مسلط ہوئے ہیں اور اس کام کے لیے کھڑے ہو جائیں جس کی خاطر انھیں کتاب اللہ دی گئی تھی۔ لیکن اگر وہ اس سے منہ موڑتے ہیں تو پھر جو تدبیریں چاہیں کر کے دیکھ لیں یقین جانیے کہ کسی ایک فتنہ کا بھی سدباب نہ ہو گا بلکہ ہر تدبیر چند اور فتنے قائم کر دے گی۔

آپ نے جو سوال ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس کے متعلق میں دو باتیں واضح طور پر عرض کیے دیتا ہوں تاکہ آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والے اصحاب کو آئندہ اس سلسلہ میں کوئی الجھن نہ پیش آئے۔

اول یہ کہ ہماری جماعت کے مقصد قیام کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ یہ جماعت کسی ملک یا قوم کے وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر وقتی تدابیر سے ان کو حل کرنے کے لیے نہیں بنی ہے، اور نہ اس کی بنائے قیام یہ قاعدہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے جس وقت جو اصول بھی چلتے نظر آئیں ان کو اختیار کر لیا جائے۔ اس جماعت کے سامنے تو صرف ایک ہی عالمگیر اور ازلی و ابدی مسئلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہر ملک اور ہر قوم کے سارے وقتی مسائل آجاتے ہیں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کس چیز میں ہے؟ پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل اس جماعت کے پاس ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام بندگان خدا (جن میں ہندوستان کے مسلمان بھی شامل ہیں) صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اختیار کریں اور اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے سارے پہلوؤں سمیت ان اصولوں کی پیروی میں سپرد کر دیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اس مسئلے اور اس کے اس واحد حل کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور جو شخص بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہو اسے لازم ہے کہ ہر طرف سے نظر ہٹا کر پوری جمعیت خاطر کے ساتھ اس شاہراہ پر قدم جمائے چلتا رہے۔ اور جو شخص اتنی ذہنی و عملی یکسوئی بہم نہ پہنچا سکے، جس کے ذہن کو اپنے ملک یا اپنی قوم کے وقتی مسائل بار بار اپنی طرف کھینچتے ہوں اور جس کے قدم بار بار ڈگمگا کر ان طریقوں کی طرف پھسلتے ہوں، جو دنیا میں آج رائج ہیں، اس کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے ان ہنگامی تحریکوں میں جا کر اپنا دل بھر لے۔

دوم یہ کہ ووٹ اور الکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجیے۔ پیش آمدہ انتخاب یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو، بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنا پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور کے اصول پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہے۔ اگر ہندوستان کے علما، اور عامۂ مسلمین اس حقیقت سے ذہول برت رہے ہیں اور وقتی مصلحتیں ان کے لیے مقتضیاتِ ایمانی سے اہم تر بن گئی ہیں تو اس کی جوابدہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے۔ لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشے سے اس اصولی مسئلے میں موجودہ نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے۔ آپ خود ہی سوچ لیجیے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر ہم کس طرح انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کو شرک قرار دیں اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے ان لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے اختیارات غصب کرنے کے لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لیے اس معاملہ میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے میں صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدائی ہے اور قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے۔ جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب اور کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔

مطبوعات

النظر فی الحدیث:۔ تالیف مولانا ابو سعید صاحب جھکاوی۔ ضخامت ۲۲۲ صفحات۔ قیمت دو روپے ۸ آنے

ملنے کا پتہ:۔ انجمن حزب الاسلام، مقام و ڈاک خانہ مصطفیٰ آباد۔ ضلع سارن (بہار)

یہ کتاب اصول حدیث سے تعلق رکھتی ہے۔ جس میں علمائے محققین کی تصانیف سے مدد لیتے ہوئے موضوع سے متعلق تمام مباحث پر مفصل اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ دین میں حدیث کی حیثیت کیا ہے؟ اس کی تدوین کی تاریخ کیا ہے اور اس تدوین کا طریقہ کیا رہا ہے؟ روایت اور درایت کے اصول کیا ہیں؟ راویوں اور کتب احادیث کے کتنے طبقات و مدارج ہیں؟ مسلمانوں کے مختلف فرقے اختلافی مسائل میں حدیث کی کن اور کس درجہ کی کتابوں سے اپنے مذہب کے حق میں استدلال کرتے ہیں؟ "تمسک بالحدیث" کے بارے میں لوگوں نے کس افراط و تفریط سے کام لیا ہے اور صحیح و معتدل راہ کون سی ہے؟

مصنف نے ان تمام مباحث پر بالکل غیر جانبدارانہ اور آزادانہ نظر ڈالی ہے اور تحزب سے بالاتر ہو کر خالص علمی اور تحقیقی انداز بحث اختیار کیا ہے جس میں اجتہاد فکر کی جھلک بھی موجود ہے اور اس حقیقت کو واضح کرنے کی ایک حد تک کامیاب کوشش کی ہے کہ "باوجود ان تمام ممکن احتیاطوں اور تدبیروں کے جو محدثین کرام نے تنقید حدیث میں اختیار کیں، یہ دعویٰ کرنا عقل عام اور تجربہ کے خلاف اور بشری فہم و نظر کے منتہائے دسترس سے ناواقفیت کا ثبوت ہے کہ ان کی رائے اور تحقیق بس آخری چیز ہے اور اب ہم کو آنکھیں بند کر کے ان کے مندرجات کو فرامین رسول تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہ محدثین اپنی تمام تر احتیاط، تحقیق، دیانت اور جلالت شان کے باوجود بہر حال انسان ہی تھے اور ان کی حیثیت فن حدیث کے 'مجتہد' سے زیادہ نہیں اور مجتہد کی تعریف ہی یہ ہے کہ قد یخطی و یصیب، کبھی وہ غلطی کر جاتا ہے اور کبھی صحیح رائے قائم کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صحیح بخاری کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، بالکل بے معنی ہوتا۔ چنانچہ علمائے سلف میں سے بعض محققین کی تحقیق کہ صحیحین میں بھی تقریباً دو سو حدیثیں ضعیف ہیں اس امر واقعہ پر ایک برہان جلی ہے"۔

اس سلسلہ میں وہ بحث جو صحابہ کرام کی عدالت سے متعلق ہے، بڑی حقیقت افروز ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ الصحابۃ کلھم عدول' کا قول اور اصول بالکل درست ہے مگر اندھی عقیدت میں مبتلا ہو کر لوگوں نے اس کے اصل مفہوم کو اس کی حدود سے متجاوز کر دیا ہے۔ صحابہ کے راست باز ہونے میں کلام نہیں مگر دیانت اور راست بازی کسی طرح بھی فہم کامل، تفقہ اور ضبط الفاظ و معانی کو مستلزم نہیں۔ اسی طرح اصول درایت پر جو کچھ لکھا گیا ہے، بحیثیت مجموعی بہت خوب ہے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ ان اصولوں میں اسلام کی اصولی دعوت اور اس کے مزاج کو بھی ایک اصول اور معیار ٹھہرایا جائے اور جو احادیث اس معیار پر

پوری نہ اتریں ان کی حتی الوسع تاویل کی جائے اور اگر تاویل ممکن نہ ہو تو ان کے تسلیم کرنے میں انکار یا کم از کم توقف سے کام لیا جائے جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے۔ کتاب محققانہ اور مجتہدانہ انداز میں لکھی گئی ہے اس لیے جہاں تک مقصد بحث اور طریقۂ بحث کا تعلق ہے ہم اس کو بنظر استحسان دیکھتے اور زبان اردو میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھتے ہیں، مگر اجتہادی آرا میں اختلاف ایک فطری شے ہے۔ اس لیے مصنف کی بہت سی باتوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ان کی اس رائے سے ہمارے لیے اتفاق کرنا کسی طرح ممکن نہیں کہ اقوال رسول تو درکنار قرآن مجید تک میں ایسے امور مذکور ہیں جو اسلام کے نہیں بلکہ مخاطب اقوام کے مسلمات ہیں — ایسے مسلمات جو مبنی بر حقیقت و مطابق واقعہ ہیں اور ایسے مسلمات بھی جو خلاف حقیقت اور خلاف واقعہ ہیں — قرآن ان دونوں ہی قسم کے مسلمات کو بغیر کسی تصریح کے کہ یہ غیروں کے غلط مسلمات ہیں، اپنے طور پر ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے بیان کر کے مخاطب پر حجت قائم کرتا ہے" حالانکہ قرآن تو الگ رہا نبی اکرم نے بھی کبھی اس طرز بیان کو اختیار نہیں فرمایا۔ اللہ اور اس کا رسول اس سے بہت بلند ہے کہ غیر واقعی نظریات کو حقائق کی طرح بیان کرے اور صرف مخاطب کو خاموش کرنے کے لیے حقائق کے بجائے موہومات سے کام لے۔ گو یہ خیال نیا نہیں بلکہ پرانے اہل قلم کے ہاں بھی اس کا وجود ملتا ہے مگر یہ وہی حضرات ہیں جن کے دماغ پر قرآن کے فطری طرز استدلال کی جگہ منطقی جدلیات چھائی ہوئی تھیں۔ حاشا کہ قرآن ان اوچھے ہتھیاروں کا محتاج ہو۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن کا کام حقائق اشیاء بیان کرنا نہیں، مگر جب بھی وہ ان کا ذکر کرتا ہے تو صرف مخاطب کے مسلمات ہونے ہی کا لحاظ نہیں کرتا بلکہ یہ بھی دیکھ لیتا ہے کہ اسے مطابق واقعہ ہونا چاہیے۔ اور اگر کبھی وہ مخاطب پر اتمام حجت کے لیے ایسی باتیں بیان کرتا ہے جو مخاطب کے نزدیک مسلمہ تو ہوں مگر خلاف واقعہ بھی ہوں تو وہاں ایسے الفاظ اور اسالیب بیان سے کام لیتا ہے جن سے اس امر کی روز روشن کی طرح وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ مسلمہ قرآن کو تسلیم نہیں۔ اس مختصر تبصرہ میں ہم کوئی تفصیلی بحث نہیں کر سکتے مگر فاضل مصنف کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اگر وہ اسی آیت وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ کے الفاظ پر، جس کو انھوں نے بطور مثال پیش کیا ہے۔ اسی مضمون والی دیگر آیات قرآنیہ کی روشنی میں تدبر فرمائیں گے تو ان پر اپنی رائے کی غلطی خود بخود واضح ہو جائے گی۔ یہ طرز فکر تو اس مرعوب ذہنیت کی غمازی کرتا ہے جس نے جاہل مستشرقین کے اعتراضات واہیہ کے آگے سپر ڈال کر یہاں تک تسلیم کر لیا کہ قرآنی قصص بھی اسرائیلیات سے لے لیے گئے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح ہیں یا غلط قرآن کو تو صرف عبرت و نصیحت سے غرض تھی۔ سو اہل کتاب کے ہاں جس طرح یہ قصے مشہور تھے، لوگوں کی عبرت پذیری کے لیے جوں کے توں قرآن میں ذکر کر دیے گئے۔ معلوم نہیں لوگ اس قسم کی باتیں کہتے وقت قرآن کی اس صفت کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ۔ باطل کا اس کے کسی گوشہ میں وجود نہیں۔ نہ احکام میں، نہ دلائل میں، نہ اصلاً نہ ضمناً۔ اسی طرح آیت استخلاف نیز آیت وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ کے جو ترجمے اور مطالب بیان کیے گئے ہیں صریحاً غلط ہیں اور ان میں حد سے زیادہ تکلف سے کام لیا گیا ہے۔

مقدمہ کتاب میں ایک جگہ "تمام مذاہب حقہ" کا جو لفظ ہے اور اس کے ضمن میں غیر مسلم اقوام سے جو مذہبی خواہش اتحاد ظاہر کی گئی ہے، اس کا مطلب ہم نہیں سمجھے۔ کیا خدانخواستہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "عالم گیر سچائیاں" تمام مذاہب میں مشترک ہیں اور ہر مذہب برحق ہے؟ اگر فاضل مصنف کا یہ عقیدہ نہیں ہے جیسا کہ ہم امید رکھتے ہیں، تو ان کو ایسے مخدوش الفاظ و اسالیب کے استعمال

سے سخت احتراز کرنا چاہیے۔

کتاب کے طرز نگارش کے متعلق یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اس میں تصنع اور الجھاؤ اور ادبی نقائص حد سے زیادہ ہیں بعض مقامات پر تضاد بیان بھی موجود ہے۔ پھر طباعت کی غیر معدود غلطیاں ان سب پر مستزاد ہیں لیکن ان سب نقائص کے باوجود اس کتاب کے افادی پہلو سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور ہم اہل علم سے سفارش کریں گے کہ وہ اس کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

گلدستۂ مدح صحابہ :۔ مرتبہ ابوداؤد صاحب لکھنوی۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات۔

ملنے کا پتہ :۔ دفتر "الداعی" دار المبلغین، لکھنؤ۔

یہ رسالہ دراصل دار المبلغین لکھنؤ کے ماہنامہ "الداعی" کا ایک خاص نمبر ہے جس میں ان تمام مدحیہ نظموں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے جو آل انڈیا مدح صحابہ مشاعرہ ۱۳۶۲ھ میں پڑھی گئی تھیں۔ اس مجموعے میں چھوٹے بڑے تقریباً ستر شعرا کے کلام ہیں اور بعض بعض ادب و شعر کا بہترین نمونہ ہیں۔ گو موضوع کے پیش نظر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ غلو اور مبالغہ کی آمیزش سے یہ نظمیں پاک ہیں مگر "ترقی پسند ادب" کی ایسی گرم بازاری میں، جبکہ فنون لطیفہ اور ادب لطیف کے نام پر ہر طرف "فنون خبیثہ" اور "ادب خبیث" کی غلاظتیں بکھیری جا رہی ہیں، اس قسم کی نظمیں انسانی، اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے بسا غنیمت ہیں۔

ابتدا میں صدر مشاعرہ جناب جگر مراد آبادی کا ایک مختصر خطبۂ صدارت ہے جس میں انھوں نے عام شعرا و ادبا کو قابل قدر نصیحتیں فرمائی ہیں، کاش یہ لوگ ان پر کان دھریں اور اپنے اخلاقی فرائض کو محسوس کریں۔

شعر و شاعری اور تحریک مدح صحابہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مجموعہ خصوصیت سے جاذب نظر ہوگا۔ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ اب وہ ہم کو نبیؐ اور اصحاب نبیؐ کی مدح و منقبت بیان کرتے رہنے کی منزل سے آگے لے جائے اور ان کی شخصیتوں کی طرح ان کے کاموں کا بھی عشق عطا فرمائے۔

دیگر اداروں کی کتابیں

جو

مکتبۂ جماعت اسلامی دار الاسلام میں موجود ہیں!

عبادت --- ۲ر	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر -- ۶ر	اسلام کا سیاسی نظریہ فلاح عالم ۸ر	تفسیر سورہ قیامہ -- ۸ر
خدا کی اطاعت کس لئے ۲ر	ایمان کی کسوٹی --- ۲ر	عورت اور اسلام -- ۱۲ر	سورہ لہب -- ۶ر
مسلمان کا بنیادی عقیدہ (مجلد) ۲ر	کلمۂ طیبہ کے معنی ---- ۲ر	مسلمان کی پہچان -- ۵ر	سورہ مرسلات ۵ر
(مجموعہ چار) ۱ر	حقیقت شرک --- عہ	نظام اطاعت کی تین کڑیاں ۴ر	سورہ والتین - ۶ر
خطبہ تقسیم اسناد - ۲ر	اسلام اور اشتراکیت -- عمر	مولانا سندھی کے افکار پر ایک نظر ۱۲ر	سورہ شمس -- ۶ر
راہ عمل --- ۶ر	اسلامی نظام --- عمر	ذہنی زلزلے ---- ۱۲ر	سورہ عبس - ۶ر
		اقسام القرآن --- ۸ر	

دعوت دین اور اس کا طریق کار

از مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا اصلاحی نے اس کتاب میں ایک طرف تو موجودہ طریقہ تبلیغ کی خامیوں کو واضح کیا ہے، اور دوسری طرف انبیا علیہم السلام کے طریقہ تبلیغ، طریقہ تربیت اور دعوت دین کے مکمل طریق کار پر مفصل اور مدلل روشنی ڈالی ہے۔

جو لوگ اسلام کو ایک ہمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے پھر زندہ و کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اسی طریقہ پر کام کرنے کو صحیح سمجھتے ہیں جو انبیائے کرام نے اپنے اپنے زمانے میں ہدایت خداوندی کے تحت اختیار کیا تھا، اس کتاب میں اپنے لئے بہت کچھ پائیں گے، اور اس کے مطالعے سے محسوس کرینگے کہ ان کی راہ کے بہت سے پتھر ہٹ گئے ہیں اور بہت سی تاریک راہیں روشن ہو گئی ہیں۔

پاکستان ــ جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اور جسکو قرارداد مقاصد کے ذریعہ اسلام کے نظام زندگی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اس بات کا حقدار ہے کہ اس کے باشندے اپنے اندر ان صفات کو پرورش دیں جو اسلام کی دعوت کے لئے ضروری ہیں، تاکہ وہ اسلام کو صرف اپنے ملک میں حاکم و حاوی بنانے کی جد و جہد کریں بلکہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے لئے بھی مشعل راہ بن سکیں۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب اس مقصد میں مددگار ثابت ہو گی

جلد شائع ہو رہی ہے

ارتداد کی سزا

اسلامی قانون میں

از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتابچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو مولانائے محترم نے وقتاً فوقتاً رسالہ ترجمان القرآن میں لکھے تھے۔

مسلمانوں نے مغرب سے مرعوب ہو کر اسلام کے جن مسائل کو شبہہ اور شرم کے ملے جلے جذبات سے دیکھا اور شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں نے جنکو اسلام سے خارج ہی سمجھنا شروع کر دیا ان مسائل میں سے ایک مسئلہ ارتداد کا ارتکاب کرنے والے کی سزا سے بھی متعلق تھا۔

مولانا مودودی نے اس مسئلہ پر پوری مدلل روشنی ڈالی ہے اور اس کا مطالعہ علم سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

جلد شائع ہو رہی ہے

ملنے کا پتہ،

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ ـ لاہور ـ پاکستان

سرورق زرین پریس لاہور میں چھپا